مذہب، گروہی تعلقات
اور
تنازعہ کشمیر

یوگندر سکند

ترجمہ: محمد یحییٰ خان

مشعل

MashalBooks.org

1

مذہب، گروہی تعلقات

اور

تنازعۂ کشمیر

جوگندر سکند

ترجمہ: محمد یحییٰ خان

مشعل بکس

آر بی۔ ۵، سکینڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور۔ ۵۴۶۰۰ پاکستان

MashalBooks.org

2

مذہب، گروہی تعلقات
اور
تنازعۂ کشمیر

یوگندر سکند
اردو ترجمہ: محمد یحییٰ خان

کاپی رائٹ اردو (c)2011 مشعل بکس

ناشر: مشعل بکس
آر۔ بی۔ ۵۔ سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک،
نیو گارڈن ٹاؤن لاہور 54600، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

ترتیب

1	پیش لفظ	5
2	قومیت، مذہب اور تنازعۂ کشمیر	18
3	خطرناک دشمن، اٹوٹ رشتے: یکساں مذہبی تعصّبات	27
4	کشمیر کی سیاست پر نئے سرے سے غور	34
5	کشمیر میں قیامِ امن: مذہب کے حوالے سے تخلیقی فکر	38
6	کشمیری صوفی ازم: قیام امن کے مذہبی ذرائع	43
7	کشمیر میں شریعت پر مبنی اسلام اور مکالمے کے امکانات	53
8	کشمیر میں زلزلہ، دہلی میں بم دھماکے اور ہمارا ردّعمل	63
9	دہلی کے بم دھماکے اور لشکر کا جہادی ایجنڈا	69
10	دنیا کے نام ''حمید'' کا پیغام: ایک کشمیری کی طرف سے ہوشمندی کی اپیل	74
11	کشمیر کے سب سے بڑے مدرسے میں	80
12	جماعت سٹائل اسلامی فلسفے کی مفلسی	84
13	ڈوڈہ میں بین المذاہب تعلقات	91
14	سیاست اور تبلیغی جماعت: ڈوڈہ کے مناظر	96
15	جماعت اسلامی کے اندر سے اٹھنے والی گوناگوں آوازیں	101
16	ایک مختلف ڈوڈہ	110
17	ایک دن ''گنڈوہ'' میں	116
18	کشتواڑ: مایوسی میں امید	123
19	ڈوڈہ کے یتیم: مسلسل کشمکش کے معصوم شکار	132
20	ڈوڈہ کی یتیم لڑکیوں کے لیے ریاست کیا کر رہی ہے؟	137

MashalBooks.org

21	کلاہند: قتل عام کے ایک ماہ بعد	143
22	کلاہند: قتل عام کے آٹھ ماہ بعد	148
23	ڈوڈہ میں ویلیج ڈیفنس کمیٹیوں کا قیام	150
24	بے جے پی کی ''ڈوڈہ بچاؤ'' مہم	162
25	جموں میں دلت: شنوائی کا مطالبہ	172

MashalBooks.org

پیش لفظ

میری کشمیر دیکھنے کی پہلی یادیں بہت مدھم سی ہیں۔ وہ1970ء کی دہائی کے ابتدائی سال تھے۔ میں اس وقت سات برس کا تھا۔ ہم بچپن میں سردیوں کے ہر موسم کا ایک مہینہ دہلی میں اپنے ددھیال میں گزارتے اور وہاں سے پندرہ سولہ دن کے لئے آگے ایک نئی جگہ، ایک پہاڑی مقام پر چلے جاتے جو پرندوں اور جنگلی جانوروں کے لئے ایک محفوظ علاقہ تھا۔ ہم آگرہ میں تاج محل، سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ، مدھیہ پردیش میں مندر اور قلعے یا راجپوتوں کے محلات دیکھتے اور صحرائے تھر میں دور افتادہ چھوٹے چھوٹے گاؤں دیکھنے بھی چلے جاتے۔

دسمبر1974ء میں ہم کشمیر گئے۔ جموں تک ٹرین میں سفر کیا اور پھر سری نگر تک کار میں گئے۔ مجھے اس سفر کے چند اکّا دکّا واقعات یاد آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ادھم پور کی فوجی چھاؤنی میں ہم ایک کرنل کے ہاں ٹھہرے جس نے اپنے ڈرائنگ روم میں کُھمبیاں(mushroom) اگا رکھی تھیں۔ علاقے میں اونچی اونچی چوٹیاں تھیں جن سے نیچے پتھروں اور روڑوں سے اَٹے ہوئے ڈھلان تھے۔ اِن چوٹیوں نے وادیٔ کشمیر کو جموں سے اور نیچے واقع انڈین میدانوں سے الگ کر رکھا تھا۔ خوبصورتی سے تراشے ہوئے مغل باغ بھی بہت یاد آتے ہیں، ویری ناگ میں منجمد مچھلی تالاب تھا جہاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں سے دریائے جہلم نکلتا ہے۔ پام پور میں ایک نیم روشن ریستوران ہوا کرتا تھا جس میں بیٹھ کر ہم نے لنچ کیا اور گرما گرم ''رحما'' اور چاول کھائے تھے۔

سری نگر میں ایک سٹور تھا جہاں سے ہم نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو دینے کے لئے تحفے اور خشک میووں کے کریٹ خریدے۔ پتلی پتلی کشتیاں ''شکارا'' جھیل ڈل کے پُرسکون پانیوں میں خاموشی تیر رہی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر وہ خوبصورت اور توانا و صحتمند

گوجر یاد آتے ہیں جن کی ناک شکرے کی طرح مڑی ہوئی ہوتی ہے۔ راستے میں اگر ہماری کار سڑک سے پھسل جاتی تو یہ لوگ خوش دلی سے اسے دوبارہ سڑک پر لانے میں ہماری مدد کرتے تھے۔ جب ہم چھٹیاں گزار کر واپس کلکتہ پہنچ گئے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے دل میں پھر وہیں جانے کی تمنا مچلنے لگی۔ میں اس نوعمری کے زمانے میں بھی اس صاف ستھرے اور بکھیڑوں سے پاک ماحول میں واپس جانے کے خواب دیکھتا رہتا۔ جہاں ہمالیہ کے پہاڑوں میں گم گاؤں بے شمار پہاڑی چراگاہوں سے گھرا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہیں جا کر بس جاؤں اور اون سے لدی بھیڑیں اور گچھم گچھا بالوں والی بکریاں چراؤں اور اپنی سبزیاں اُگاؤں۔

میرا جموں و کشمیر کا دوسرا 'وزٹ' 1991ء میں ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب بھارت سے ''آزادی'' حاصل کرنے کی تحریک نے ریاستی انتخابات میں زبردست دھاندلی کے باعث عسکری شکل اختیار کر لی تھی۔ ان انتخابات میں آزادی کی حامی جماعتوں کی کامیابی یقینی سمجھی جاتی تھی۔ بھارتی حکومت نے اس چیلنج کا جواب بڑے پیمانے پر تشدد اور انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی سے دیا۔ جبر و تشدد کی ایک لہر چلی آ رہی تھی جس میں اس وقت تک ہزاروں افراد، زیادہ تر کشمیری مسلمان بھارتی فوج، مقامی اور ان گروپوں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے جن کے اڈے پاکستان میں تھے۔ ان گروپوں میں کچھ سیکولر تھے، بہت سے اسلام پسند تھے اور جرائم پیشہ افراد بھی ان میں شامل تھے۔ کشمیری پنڈتوں کو تقریباً اجتماعی طور پر اپنی آبائی سرزمین سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بارے میں رائے عامہ منقسم چلی آ رہی تھی اور آج بھی اسی طرح ہے کہ ان کی بڑے پیمانے پر نقل مکانی کا ذمہ دار کون تھا۔ پنڈتوں کا اپنا کہنا اور ان کے حوالے سے بھارتی حکومت اور میڈیا کا کہنا یہ تھا کہ اس کے ذمہ دار عسکریت پسند لوگ یا پاکستان ہے جبکہ بہت سے کشمیری مسلمانوں کو شک تھا کہ یہ سب ایک سازش کا نتیجہ ہے جس کا جال اُس وقت کے گورنر جموں و کشمیر جگموہن نے بُنا تھا تا کہ تحریک ''آزادی'' کو ''مسلمانوں کی گروہ بندی'' یا اسلامی بنیاد پرستی کا رنگ دے کر اس کے جواز کو بین الاقوامی برادری کی نظروں میں مشکوک بنایا جا سکے۔

اس وقت کشمیر کا سفر محفوظ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں اس خطے میں جانے کی مشکل سے ہی

جرأت کر سکتا تھا مگر ہوا یوں کہ ایک بار اتفاقاً دہلی میں میری ملاقات ایک ہندو راجپوت سے ہوگئی جو اندازاً میری عمر کا ہی ہوگا۔ وہ ضلع ڈوڈہ کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہ پہاڑی ضلع جموں اور کشمیر کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ یہ راجپوت جلدی میرا دوست بن گیا (یہ دوستی اب تک برقرار ہے)۔1990ء کی گرمیوں میں جب ڈوڈہ میں حالات نسبتاً پُرسکون تھے۔ میں اپنے دوست کے گاؤں گیا جہاں میں نے ایک ہفتہ گزارا۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد تقریباً برابر برابر تھی اور میں نے محسوس کیا کہ گاؤں میں ان کے باہمی تعلقات بھارت کے بیشتر حصوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ خوشگوار اور خیر سگالی کے تھے۔ وہ اکثر ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے، ایک دوسرے کی دکان سے خریداری کر کے ان کی سرپرستی کرتے اور بہت سے لوگوں نے مشترکہ کاروبار بھی کر رکھے تھے۔

کوئی ایک سال سے بھی کم عرصہ ہوا ہوگا کہ یہی ڈوڈا، پیر پنجال پہاڑوں کے پار کی وادیٔ کشمیر کی طرح ایک حقیقی خطۂ جنگ میں تبدیل ہوگیا۔ میرے دوست کا اصرار تھا کہ میں گرمیاں اس کے پاس ہی گزاروں جس پر میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ صورتِ حال کتنی تیزی سے خراب سے خراب تر ہو رہی ہے، اس کی پیشکش قبول کر لی۔ جموں سے اس کے گاؤں تک سفر عام حالات میں آٹھ گھنٹے کا تھا مگر یہ عسکریت پسندی شروع ہونے سے پہلے کی بات تھی، اب دگنا وقت لگنے لگا۔ بس کو ہر پانچ کلومیٹر پر فوجی ناکہ بندیوں پر ٹھہرنا پڑ رہا تھا۔ جہاں مسافروں کو اتر کر کرخت چہروں والے سپاہیوں کے سوالوں کے جواب دینا پڑتے۔

ان گرمیوں کا ایک مہینہ میں نے ڈودہ میں گزارا۔ دوست کے گھر کو اپنا اڈہ بنا کر میں ضلع بھر کے دیہات اور قصبوں میں گھومتا پھرتا رہا اور ضلعے سے باہر بھی چلا جاتا تھا۔ عسکریت پسندوں کا تشدد اور فوج کی جبری کاروائیاں اس وقت اپنے عروج پر تھیں۔ ہر دن رقوم بٹورنے، بم دھماکوں، قتل و غارت اور اغوا کی نئی خبریں لے کر آتا جو کشمیری، پاکستانی اور افغان عسکریت پسندوں کی کارگزاریاں تھیں۔ بھارتی فوج بھی اصلی یا نقلی مقابلوں میں گولیاں چلاتی رہتی تھی۔ پورے ضلعے میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی سخت کرفیو نافذ کر دیا جاتا جو سورج طلوع ہونے کے بعد بھی جاری رہتا۔ ساری آبادی کو مذہبی بنیادوں پر

MashalBooks.org

ہندوؤں اور مسلمانوں میں بانٹنے کا عمل تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ جو لوگ صدیوں یکجا رہے اب وہ ایک دوسرے کو نفرت اور شک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اس وقت تک میرے دوست کا خاندان، خطّے کے بہت سے دوسرے ہندوؤں کی طرح دائیں بازو کے ہندوؤں کا پُر جوش حامی بن چکا تھا جبکہ خاندان کے بہت سے نوجوان راشٹر یا سیوک سنگھ (RSS) کے فعالیّت پسندوں کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ وہ ہر صبح مقامی مندر کے باہر گھاس بھرے میدان میں روزانہ کے ''شاکھا'' کے لئے پہنچتے جو آر ایس ایس کی ایک مخصوص ورزش تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ گاتے تھے جو میرے خیال کے مطابق وحشیانہ اینٹی مسلم نظمیں تھیں مگر اُن کے خیال میں یہ ہندو مناجات تھیں۔ شاموں کو وُہ ایک مکان کے احاطے میں چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے۔ گاؤں کے دیگر ہندو نوجوان بھی آ جاتے، اور ان بھر کے واقعات پر اظہار خیال شروع ہو جاتا۔ ان واقعات میں عسکریت پسندوں کی تحریک، بم دھماکوں، اغوا اور قتل و غارت کی تازہ خبریں شامل ہوتیں۔ وہ یہ باتیں بھی کرتے کہ مقامی ہندوؤں کو ان لوگوں سے اپنے بچاؤ کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اگرچہ وہ مسلمان پڑوسیوں کے ساتھ ہی پلے بڑھے تھے مگر اب وہ غضبناک مسلم دشمن بن چکے تھے اور ان کا اتفاق رائے تھا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں پُر امن زندگی کبھی نہیں گزار سکتے۔ مسلمانوں سے نفرت ان سب کے دھرم کا بنیادی عنصر تھا۔ یہ بات بجائے خود ایک مذہب سے کمتر نہیں تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے دوست کے بعض رشتہ دار مجھے ایک بے جوڑ یا انوکھا آدمی پاتے، ان میں سے بعض میرے ارادوں کو مشکوک سمجھتے جبکہ چند ایک کا یہ خیال بھی تھا، جیسے کہ اس نے بعد میں بتایا، کہ میں کسی قسم کا جاسوس ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ میں عسکریت پسندوں کے بارے میں ان کے عدم تحفظ کے احساس کا ہمنوا تھا، (کیونکہ اُن کی بات اُس وقت ڈوڈا کے بڑے حصے میں ایک قانون کا درجہ سمجھی جاتی تھی) مگر میں نے واضح کر دیا تھا کہ میں ان کی مسلمانوں کے ساتھ دلی دشمنی پر مبنی خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ وہ میری ان باتوں کو غدّاری سے کم سمجھنے پر تیار نہیں تھے اور انہوں نے اپنے اس احساس کو مجھ پر اچھی طرح واضح کر دیا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نے چند مقامی مسلمان نوجوانوں

سے دوستی رکھی ہوئی ہے تو وہ اتنے برافروختہ ہو گئے کہ انہوں نے میرے دوست سے کہا کہ وہ مجھے گاؤں فوراً چھوڑ دینے کے لئے کہہ دے۔ یہاں مجھے اپنے دوست کے میرے ساتھ تعلقات نبھانے کے عزم کا لازماً اعتراف کرنا چاہئے۔ اس نے اپنے ناراض رشتے داروں سے واضح طور پر کر دیا کہ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ اپنی بات کو زیادہ قوت سے منوانے کے لئے اس نے یہاں تک کر دیا کہ میرے مسلمان دوستوں کو اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دے دی۔ ایسے حالات میں جب ڈوڈہ کے طول و عرض میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے، یہ ایک ناقابل تصور بات تھی۔

جس طرح راشٹریہ سیوک سنگھیوں (آر ایس ایس) نے ڈوڈہ کے ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد کے اندر اپنی جڑیں گہری کر لی تھیں، مجھے اپنے پہلے وزٹ میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ دائیں بازو کے اسلامی گروپوں کو بھی ضلعے میں کافی سپورٹ حاصل ہو چکی ہے۔ مقامی مسلمانوں کی ایک وافر تعداد اسلامی جنگجوؤں کے ساتھ مل گئی تھی اور ان میں سے بہت سے فوجی تربیت کے لئے سرحد پار کر کے پاکستان بھی چلے گئے تھے۔ ان میں سے بعض نے واپس آ کر ڈوڈہ میں بم دھماکے کرنا شروع کر دیئے، جن میں بیسیوں بے گناہ افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کے بھارتی مسلّح افواج سے مقابلے ہوئے جن میں ان میں سے خاصی تعداد ماری گئی۔ ان میں سے بعضوں نے لوٹ مار جنسی زیادتیوں اور ذاتی انتقام کے لئے بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں۔

خیال کیا جاتا تھا کہ وادیٔ کشمیر کی طرح ڈوڈہ کے مسلمانوں کی اکثریت بھی جنگجوؤں کے مطالبۂ آزادی کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہے۔ اگرچہ یہ بات واضح نہ تھی کہ کیا ان کی اکثریت پاکستان کے ساتھ الحاق کی حامی تھی یا خودمختار جموں و کشمیر کے حق میں تھی۔ البتہ یہ واضح تھا کہ مسلمان ہونے کے ناطے انہوں نے اپنی پسند کا پوری قوت کے ساتھ اظہار کر دیا ہے۔ وہ یا تو مسلم پاکستان کی حمایت میں تھے یا مسلم اکثریت کی خودمختار ریاستِ جموں و کشمیر کے حامی تھے اور ہندو انڈیا کے ساتھ الحاق کے شدید مخالف تھے لیکن اس میں وہ ڈوڈہ کے ہندوؤں سے مختلف نہیں تھے جن کی مذہبی وفاداریوں نے بھی ان کی سیاست کا تعیّن کر دیا تھا۔ وہ ہندو اکثریت کے حامل بھارت کے ساتھ جموں و کشمیر کے الحاق کے

پُر جوش حامی تھے۔ مجھ پر یہ بات شروع ہی سے واضح تھی کہ تنازعۂ کشمیر کی اصل بنیاد عدم برداشت اور منافرت پر مبنی اختصاصی فہمِ مذہب و معاشرت پر استوا ہے۔

جیسے کہ ہندوؤں کا معاملہ ہے ڈوڈہ کے اس دورے (اور بعد کے دورے میں بھی) میں جن مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی ان کے سیاسی رویّوں کی تہہ میں مذہب پر مبنی ثقافتی میلانات اور سوچیں کارفرما پائی گئی ہیں۔ میں اہل حدیث (سعودی وہابیوں کے جنوب مشرقی مکتبۂ فکر کے حامی) فعالیّت پسندوں سے ملا جن کا اصرار تھا کہ ہندو ''غیر کشید کردہ جھوٹ'' (undistilled falsehood) کے پیروکار ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ تمام مسلمانوں جو ان کے مکتبۂ فکر کی پیروی نہیں کرتے فی الحقیقت مرتد ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے پُر جوش وکیل تھے۔ میں نے تبلیغی جماعت کے کارکنوں سے بھی گپ شپ کی۔ یہ جماعت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی تحریک ہے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ غیر مسلم دائمی عذاب کے لئے دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ یہ موقف فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور کسی بھی صُلحِ کل تحریک کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ میں جماعت اسلامی کے جوشیلے لوگوں سے بھی ملا جو کہ جنوبی ایشیا میں اسلام کی ایک بلند پایہ پارٹی ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ اسلام ہر مسلمان پر زور دیتا ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے بھرپور جدوجہد کرے، اگر ضرورت پڑے تو وہ تشدد سے بھی کام لے سکتا ہے۔ انہوں نے پُر جوش انداز میں کہا کہ جمہوریت اور سیکولرازم اسلام کی رُو سے سخت ممنوعہ راستے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کشمیر کو بھارت کے کنٹرول سے آزاد کرایا جائے خواہ اس کے لئے جہاد کیوں نہ کرنا پڑے۔

ان کا دعویٰ ہے کہ جب تک کشمیر ایک ''کافر ریاست'' کی غلامی میں رہے گا کشمیری مسلمان مناسب انداز میں اور پوری دلجمعی سے اپنے ایمان کے مطابق عمل نہیں کر سکیں گے۔ میں اکثر خودساختہ اسلامی ریڈیو سٹیشن کو ''ٹیون'' کرتا جو سرحد پار، پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں قائم ہے۔ اس سے ہونے والی معمول کی نشریات میں یہ خبریں دی جاتیں کہ ہندو کافر سپاہی ریاست کے بھارت کے زیر قبضہ حصے میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ اس سے مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ مقامی مسلمانوں کے دلوں میں بھارتی

MashalBooks.org

حکمرانی کے خلاف سخت مخاصمت کے جذبات پیدا کئے جا رہے ہیں جن کا اظہار ایک جاری متشددانہ بغاوت کی شکل میں ہو رہا ہے۔ اس صورتِ احوال کو انڈین سٹیٹ کے ہندوانہ مزاج کے بارے میں عام تاثر، اس کی ایجنسیوں کی ناقص کارکردگی اور ان حقیقی نااہلیوں نے مزید پیچیدہ بنا دیا جن کی وجہ سے بھارت کے کئی دوسرے حصوں کے مسلمانوں کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان میں وقتاً فوقتاً پھوٹنے والے تشدّد کے واقعات بھی شامل تھے جیسے کہ گجرات میں وسیع پیمانے پر نسل کشی کی گئی تھی۔ یہ مظالم ہندو بلوائیوں اور ریاستی حکام کے ساز باز کا نتیجہ تھے۔

میں 1990ء میں کئے ہوئے دورے کے بعد تقریباً ہر سال ڈوڈہ جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے میرے دوستوں کا حلقہ مسلسل بڑھتا آ رہا ہے۔ ان میں درجنوں ہندو اور مسلمان شامل ہیں۔ خطّے کے ان سالانہ دوروں کی وجہ سے میری ابتدائی پیش آگاہی کے درست ہونے کے ٹھوس شواہد سامنے آ چکے ہیں اور وہ یہ کہ تنازعۂ کشمیر کا اصل سبب ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں منفی اور مغائرت پر مبنی سوچ ہے۔ میں غیر متزلزل طور پر اس امر کا قائل ہوں کہ اس بظاہر بے قابو اور پیچیدہ مسئلہ کشمیر کی جڑیں اقتصادی اور سیاسی دائرے میں کم اور مذہبی و ثقافتی شعبے میں زیادہ ہیں۔ خصوصاً اس بات میں ہیں کہ ہندو اور مسلم مذہبی اور معاشرتی شناختوں کے تصورات کی تمہید ہی ایک دوسرے سے سنگدلانہ عداوت پر رکھی گئی ہے۔ ہر بار جب میں ڈوڈہ جاتا تو مجھے ہندوؤں اور مسلمانوں سے میل ملاپ میں یہ بات تکلیف دِہ طور پر اپنی یاد دلاتی اور مجھے ہندو اور مسلم تحریکوں میں فعال کردار ادا کرنے والے اپنے دوستوں میں بھی دکھائی دیتی۔ مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ تنازع کی اصل جڑ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے تاریخی دشمن ہونے کا احساس نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور دونوں اپنے اپنے مذہب کو دوسرے کے مذہب کا بے حد مخالف پاتے ہیں۔ یہی تاثر تقسیمِ ہند کی بنیاد بنا جس سے بھارت اور پاکستان میں مستقل رقابت کی فضا قائم ہوئی اور بظاہر یہی سبب بھارت میں بار بار پھوٹ پڑنے والے ہندو مسلم فسادات کو جنم دیتا رہتا ہے اور جموں و کشمیر کے سیاسی مستقبل کے جھگڑے کی طوالت کی بنیاد بھی بنا ہوا ہے۔

MashalBooks.org

میرے اس شعور نے (ہندوازم اور اسلام کے بارے میں نفرت بھرے اور اختصاصی فہم (exclusivist understandings) اور جموں و کشمیر کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے جاری کشمکش کے اسی فہم پر مبنی ہونے کے باعث) مجھے اس سخت ضرورت کا احساس دلایا کہ میں مذہب اور گروہی تشخص کے متبادل تصورات تلاش کروں تاکہ مذہبی اور گروہی 'مغائرت' کے لئے زیادہ قابل قبول، مثبت اور جامع تجاویز سامنے آ سکیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کام کو تنازعۂ کشمیر کے کسی بھی دیرپا حل میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح یہ بھارت اور پاکستان کے کشیدہ تعلقات اور بھارت کے اندر ہندو مسلم کشیدگی میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مکالمہ بین المذاہب اور مذہب کے سماجی ترقیاتی فہم کو آگے بڑھانے والے بڑے بڑے مذاہب خاص طور پر اسلام اور ہندوازم جو مذہبی تکثیریت کے بھی علمبردار ہیں کیونکہ وہ فرقہ وارانہ اختصاص، تعصب اور مذہب کے نام پر منافرت پھیلانے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اب وہ اس بات پر اپنے پختہ یقین کا اظہار کر رہے ہیں کہ کشمیر میں منصفانہ امن کے قیام کے لئے کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے اس امر پر حیرت، بلکہ صدمہ ہوا کہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے کوشاں حکومتوں، بین الاقوامی تنظیموں، این جی اوز اور دیگر سول سوسائٹی گروپوں نے اس مقصد کو تقریباً مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے جسے کہ میں بے حد ضروری اور قطعی طور پر ناگزیر کام سمجھتا ہوں۔

1997ء میں جب کشمیر میں عسکریت پسندی اپنے عروج پر تھی مجھے ممبئی میں قائم "Centre for Study of Society & Secularism" نے ایوارڈ دیا، اس مرکز کے سربراہ ایک انتھک سکالر فعالیّت پسند اصغر علی انجینئر ہیں۔ مجھے جو کام سونپا گیا وہ یہ تھا کہ میں کشمیری تصوّف کی شاندار روایات پر تحقیق کر کے اس سے متعلقہ مواد مرتب کروں، بالخصوص ان میں موجود دینیاتی وسائل و منابع پر توجہ مرکوز کر کے انہیں بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لئے بروئے کار لاؤں، اختصاص (exclusivism) پر تنقید کروں اور مذہبی مغائرت سے نفرت کے رویّوں کو سامنے لاؤں۔ چنانچہ اس سال میں نے ساری گرمیاں وادیٔ کشمیر میں گزاریں جہاں میں خطّے کے متعدد صوفیوں کی درگاہوں میں جاتا رہا۔ نیم روشن لائبریریوں میں تصوّف کی کتابیں تلاش کرتا اور ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ میں نے کئی مزاروں کے متولّیوں

اور سجادہ نشینوں سے انٹرویو لئے اور اس موضوع پر کتابیں لکھنے والوں سے بھی تبادلہ خیال کیا۔ ان متولّیوں اور مصنفین میں کشمیری تصوّف کے کئی سلسلوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس کام میں صرف کئے ہوئے عرصے میں مجھ پر بہت سے اسرار منکشف ہوئے اور حیرت سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ اس سے مجھے ایسے اسلام سے آگاہی کے راستے مل گئے جو میرے ڈوڈہ کے ابتدائی دوروں میں معلوم ہونے والے اسلام سے بہت مختلف تھا۔ اُس زمانے میں میری ملاقاتیں رسم و رواج پر مبنی اسلام کے علمبردار وہابیوں اور سخت گیر لغوی اسلام پیش کرنے والوں سے ہوا کرتی تھیں اور اب مجھے سماج کی ان خادم ہستیوں سے میل ملاقات کا موقع ملا جو نسل در نسل رحم و شفقت کے مذہب کا درس دے رہے تھے۔ یہ ساری مخلوقِ خدا کو سماجی انصاف دلانے کے لئے ذات پات اور عقیدے کی تنگ حدود سے بلند تر ہو کر کام کرنے والے لوگ تھے۔ میں اس امر کا قائل ہو گیا کہ ان لوگوں کی عملی زندگی اور تعلیمات نہ صرف ہمارے لئے بیش قیمت ہیں بلکہ امن و آشتی کی تلاش کے ساتھ ساتھ تنازعۂ کشمیر کے منصفانہ حل کے لئے بھی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان سے وہ مذہبی کارکن اور وطن پرست جنگجو بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو تنازعۂ کشمیر کے ذمہ دار ہیں اور خطّے میں خون ریزی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مگر شاید ان سے یہ توقع رکھنا بہت زیادہ تخیلاّتی بات ہو گی۔ میں نے ان سے تھوڑا بہت اختلاف کرتے ہوئے اپنی تحقیق پر مبنی دو درجن سے کچھ زائد مضامین لکھے جو کشمیر، بھارت اور پاکستان کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ تنازعۂ کشمیر پر متوازن مکالمے کو فروغ دینے کے ئے میری بہت ہی عاجزانہ کوشش تھی۔ 1998ء میں ''سنٹر فار دی سٹڈی آف سوسائٹی اینڈ سیکولرازم'' نے میری تحقیق پر مبنی میرا ایک موضوعی رسالہ شائع کیا جس کا عنوان :

The Role of Kashmiri Sufis in the
Promotion of Communal Harmony and Social Reform

(''فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ اور اصلاحِ معاشرہ میں کشمیری صوفیوں کا کردار'') تھا۔

چند برس بعد مجھے ایک اور ریسرچ فیلوشپ ملی، اس بار یہ دہلی میں قائم

"Women in Security, Conflict Management and Peace" (Wiscomp) کی طرف سے تھی۔ یہ ''فاؤنڈیشن فار یونیورسل ریسپانسبلٹی آف دی دلائی لامہ'' کا جزو تھی۔ اس کا مقصد عہدِ حاضر کے جموں وکشمیر میں مکالمہ بین المذاہب کے امکانات کا جائزہ لینا اور انہیں تنازعہ طے کرنے کا ذریعہ بنانا تھا۔

اس پروجیکٹ کے لئے میں نے تقریباً نصف سال ریاست بھر کے سفر میں گزارا۔ جس میں مجھے بیسیوں ہندوؤں، سکھوں، بودھوں اور مختلف پس منظر رکھنے والے دلتوں سے ملاقاتیں کر کے ان کے خیالات معلوم کرنے تھے۔ ان میں پادری، لامے، امام، مولوی، اور عام سطح کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ اس سے مجھے ان طریقوں کو جاننے اور سمجھنے میں مدد ملی جن سے مذاہب کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ ان کے خیالات اور کہانیوں سے یہ بات بالکل واضح ہو رہی تھی کہ ہر مذہب کی تشویشناک حد تک مختلف ومتنوع تعبیرات کی جا سکتی ہیں۔ بعض تعبیریں متشددانہ طور پر اختصاصی (exclusivist) اور فاتحانہ انداز لئے ہوتی ہیں اور دیگر مذاہب اور ان کے پیروکاروں کو یکسر مسترد کر دیتی ہیں جبکہ بعض مشمولہ (inclusive) ہو سکتی ہیں جو دیگر مذاہب اور ان کی پیروی کے دعویداروں کو آسانی سے قبول کر لیتی ہیں۔ ان کے بیانات کی روشنی میں مجھ پر مزید واضح ہو گیا کہ کشمیر کے مخصوص سیاق وسباق اور ایسی دیگر کشمکشوں میں جن میں مختلف مذہبی شناختوں اور فرقہ وارانہ وابستگیوں کے حامل عناصر ملوث ہوں، یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ہر مذہب کی مؤخر الذکر بصیرتوں کو بروئے کار لایا جائے اور بھرپور طریقے سے انہیں فروغ دیا جائے۔ ساتھ ساتھ اس کے مخالفانہ مذہبی دلائل کی مذمت کی جائے جو اسی مذہب کے نام پر نفرت پھیلاتے ہیں۔ یہ تحقیق بعد ازاں ایک کتاب کی صورت میں شائع کی گئی جس کا ٹائیٹل "Religion, Peace and Dialogue in Jammu and Kashmir" تھا۔ دو سال بعد میں نے ایک اور پروجیکٹ کے لئے کئے گئے فیلڈ ورک کی بنیاد پر ایک کتابچہ شائع کیا جس کا ٹائیٹل "Kashmiri Muslim Perspectives on Inter-Faith Dialogue" تھا۔ اس پروجیکٹ کو بین الاقوامی این جی او "Oxfam" نے سپانسر کیا تھا۔ یہ کتابچہ کشمیری اماموں، صوفیوں اور اسلام کے ترقی پسندانہ فہم رکھنے والے اہل علم کے تفصیلی انٹرویوز کا مجموعہ تھا۔ اس فہم کی جڑیں دیگر مذاہب

Mashalbooks.org

سے تعلق رکھنے والے عوام کے ساتھ حقیقی یکجہتی کے اندر پیوست ہیں۔ اس میں اس امر کا اظہار ہے کہ سب کے بہتر مستقبل کے لئے مل جُل کر کام کیا جائے۔

بعد کے برسوں میں، میں جموں اور کشمیر کے باقاعدہ دورے کرتا رہا۔ ریاست کے نئے حصوں کا سفر کیا جن میں صوبہ جموں کے راجوڑی، پونچھ اور کٹھوعہ، وادیٔ کشمیر کے مختلف قصبات اور دیہات اور لدّاخ میں کارگل اور لیہہ شامل تھے۔ ان دوروں سے مجھے ان مضامین کے لئے نیا مواد اور نئی بصیرت حاصل ہوئی۔ یہ مضامین متعدد مقامی، بھارتی اور بین الاقوامی اخبارات میں شائع ہوئے۔ میں نے متفرق موضوعات پر لکھا جن میں جموں میں دلتوں سے ذات پات کی بنا پر امتیازی سلوک، ڈوڈہ میں نچلی ذات کے مسلمانوں سے نفرت، بٹوٹ میں مسیحی مشنریز کی سرگرمیوں پر اعتراض، کپواڑہ میں تباہ کن زلزلے میں انسانی بحران، گوریز میں ماحولیاتی سیاحت، سوپور میں عوامی ناچ گانوں کا غائب ہو جانا، بھسولی میں کلاسیکل سکول آف آرٹ کو زندہ کرنے کی مساعی، شمالی کشمیر کے گجر اور بکروال خانہ بدوشوں کے موسمی ہنکاؤ کے روایتی انداز کے لئے چیلنج، ''ڈاہ ہانو کے ڈارڈوں'' کے مذہبی حریفوں میں میل جول کی کوششیں، پدّار میں گمنام بدھسٹ کمیونٹیز کی تاریخ، لیہہ میں زمانہ قبل از تاریخ کی چٹانوں میں نقش نگاری، کشتواڑ میں مدرسوں کی اصلاحات، اننت ناگ میں مقامی این جی اوز کے زیر اہتمام نفسیاتی و سماجی رکونسلنگ، اور کشمیری دھرماتما کی ایک جامع تاریخ شامل تھی اور ظاہر ہے کہ میں کشمیر بھر میں انڈین آرمی اور بعض عسکری گروپوں کی طرف سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر روشنی ڈالتا رہا۔ لیکن میری اصل توجہ، (جسے کہ میں اب بھی اپنا مرکزِ توجہ سمجھتا ہوں اور جسے اب بھی بڑی حد تک نظر انداز کیا جا رہا ہے)، اس سوال پر رہی،..... ایک طرف مذہب کے عدم برداشت اور اختصاص پر مبنی فہم اور مذہبی مغائرت کا تصور اور دوسری جانب امن و انصاف کے قیام کے امکانات کے لئے دیگر مذاہب و ثقافتی تکثیریت کے لئے درکار مذہب کی ترقی پسندانہ سوچ کا فروغ..... مجھے یہ یقین قطعی طور پر حاصل رہا کہ کشمیر میں منصفانہ امن کی طرف اس وقت تک کوئی پیشرفت ممکن نہیں جب تک اس اہم ترین سوال کو حل نہ کر لیا جائے۔

یہ کتاب اس فیصلہ کن سوال پر میری تحریروں میں سے منتخب کردہ مضامین پر مشتمل

ہے، جو میں نے کشمیر کے ابتدائی دوروں کے زمانے سے لکھنا شروع کئے تھے۔ قارئین کے وسیع سے وسیع تر حلقوں تک پہنچنے کے لئے یہ مضامین متعدد مقامی، بھارتی اور بین الاقوامی (زیادہ تر پاکستانی) اخبارات و جرائد، ویب سائیٹس اور آن لائن ڈسکشن گروپوں کو بھیجے گئے تھے۔ ان میں سے بعض مضامین خاص خاص واقعات کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں لیکن انہیں تاریخوں کے حوالے سے نہیں دیکھا جانا چاہئے۔ یہ کسی خاص واقعے پر توجہ مرتکز کر کے دلائل کو مذہب اور جموں و کشمیر میں انٹر کمیونٹی تعلقات کے ساتھ جوڑ کر اتنی وسعت دے دیتے ہیں کہ وہ آج بھی برموقع اور حاملِ دلچسپی بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کلہند میں قتل عام پر دو مضامین اور ڈوڈہ میں یتیموں کے قابل رحم حالات پر دو دوسرے مضامین ہیں۔ بعض مضامین جو ضلع ڈوڈہ میں عسکریت اور شدید نوعیت کی فرقہ وارانہ کشیدگی کے بارے میں ہیں وہ بھی سنگینیٔ حالات کی نشاندہی کرتے ہیں تاہم مقامِ شکر ہے کہ اب صورت حال کافی حد تک بہتر ہو چکی ہے۔ مگر یہ مضامین اس لحاظ سے بہت مفید ہیں کہ یہ خطّے کی تاریخ کے ایک اہم مرحلے کی شہادت دیتے ہیں اور ساتھ ساتھ فرقوں کے باہمی تعلقات اور مقامی مذہبی روایات کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں جن کی اہمیت بدستور برقرار رہے گی۔

میں نے ساری کتاب میں جموں و کشیر کے سیاسی مستقبل کے بارے میں اپنے جذبات کو دانستہ طور پر الگ رکھا ہے، اگرچہ قارئین میری عمومی سیاسی رائے کو بہ آسانی بھانپ لیں گے۔ ایک ایسے آدمی کے طور پر جو دلسوزی کے ساتھ یہ یقین رکھتا ہے کہ مذہب اور قومی عصبیت (جو کہ تنازعۂ کشمیر کے لازمی اجزا ہیں) کے بارے مین تنگ نظری، مردم بیزاری، اختصاص، تصادم انگیزی اور نفرت آمیزی پر گفتگوئیں بے حد شقاوتِ قلبی اور تذلیل انسانیت ہیں، میں جموں و کشمیر کے لئے تینوں مجوزہ سیاسی امکانات..... (بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق یا آزاد و خودمختار حیثیت).....کو ان کے اپنے اپنے راستوں کے حوالے سے دشوار سمجھتا ہوں، بہ ایں ہمہ میں یہ بات ضرور کہوں گا کہ میں ہر قومیت کے لئے سیاسی خود ارادیت کے حق کا سختی سے قائل ہوں۔ مسئلۂ کشمیر کے بارے میں بھارتی حکومت کے پُر جوش دفاع کاروں کو یہ بات ضرور جاننی چاہئے کہ بھارت کے لیڈروں نے جموں و کشمیر

کے لوگوں کے اس بنیادی حق کا احترام کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اس وقت کیا تھا جب بھارت خود یہ مسئلہ لے کر اقوام متحدہ میں گیا تھا اور اس نے بین الاقوامی برادری سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خطّے میں استصواب رائے کرا کر ریاست کے لوگوں کو اپنے سیاسی مستقبل کے فیصلے کا موقع دے گا۔ مختصراً یہ کہ یہاں موجودہ کشمکش بھارت کی وعدہ خلافی کا نتیجہ ہے۔ بہ الفاظ دیگر تنازعۂ کشمیر کا اس وقت تک کوئی بامعنی حل نہیں نکل سکتا جب تک بھارت (اسی طرح پاکستان بھی) جموں و کشمیر کے لوگوں کو آزادی سے اور صحیح طریقے پر ان کا حق استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

میرے پاس مداخلت کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میں لکھوں اور اپنے عاجزانہ طریقے سے مسئلہ کشمیر پر جاری بحثوں میں حصہ لوں۔ میں انتہائی تکلیف دہ احساس کے ساتھ جانتا ہوں کہ کوئی شخص بطور مصنف اپنی محدود صلاحیت کو بروئے کار لا کر لوگوں کے رویّوں میں معمولی سی بھی تبدیلی کیسے لا سکتا ہے۔ میں بعض اوقات کشمیر میں اس گھمبیر انسانی بحران کو دیکھ کر حوصلہ شکن قنوطیّت کا شکار ہو جاتا ہوں جس میں کمی کا کوئی نشان ہی نہیں ملتا۔ اس میں اس وقت مزید شدّت پیدا ہو جاتی ہے جب اس میں یہ یقینی احساسِ جُرم بھی شامل ہو جائے کہ میرا روزگار تو دوسروں کی زبوں حالی پر لکھنے سے چل رہا ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر بعض اوقات ہتھیار ڈال دینے اور خاموشی اختیار کر لینے کی ترغیب ملتی ہے۔ کشمیر کے بارے میں خاموش ہو جاتا تو ان طعنوں سے محفوظ ہو جاتا جو مجھے غیر تو غیر، اپنے ''دوستوں'' سے بھی ملتے رہے۔ وہ مجھ پر جانبداری کا الزام لگاتے حتیٰ کہ کبھی اِس پارٹی کا اور کبھی دوسری پارٹی کا ایجنٹ قرار دے دیتے لیکن پھر بھی میرے اندر موجود چیز مجھے کچوکے لگاتی اور اصرار کرتی رہی کہ میں اس موضوع پر اپنے مافی الضمیر کا کھل کر اظہار کرتا رہوں۔ اگر اس کتاب نے چند ایک ہی لوگوں کو اس مذہبی اور قومی شادنزم کی ہولناکیوں سے حسّاس بنا دیا جس نے تنازعۂ کشمیر کو اتنا ہٹیلا اور بے قابو بنایا اور مذہب پر بطور نجات دہندہ عمل کرنے کے امکانات کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے قابل بنا دیا ہے جس سے کشمیر میں منصفانہ امن کے فروغ میں مدد مل سکتی ہو تو اس سے میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

MashalBooks.org

شملہ اکتوبر 2010ء

قومیّت، مذہب اور تنازعۂ کشمیر

''اگر انڈیا کشمیر کی گلیوں میں سونا بھی بچھا دے تب بھی ہم انڈین کہلانے سے انکار کر دیں گے۔'' یہ بے لچک بیان گزشتہ روز میرے ایک کشمیری مسلمان دوست نے دیا۔ وہ کوئی پُرجوش حامیٔ اسلام یا شعلہ نوا کشمیری نیشنلسٹ نہیں ہے۔ درحقیقت وہ مذہب کے معاملے میں بالکل ڈھلمل یقین ہے حتیٰ کہ ''لاادریہ'' (agnostic) ہونے کی سرحدوں پر رہتا ہے۔ اس کے بیسیوں غیر مسلم اور غیر کشمیری دوست ہیں جنہیں وہ ''انڈین'' فرینڈز کہتا ہے تاہم وہ بہت سے دوسرے کشمیری مسلمانوں کی طرح اپنے وطن کی آزادی کی پُرجوش وکالت کرتے ہوئے کہتا ہے: ''ہم کشمیری کبھی انڈین نہیں تھے اور کسی صورت میں خود کو ایسے کہلانا پسند نہیں کر سکتے۔'' وہ آج ان ہزاروں لڑکوں کو بے وقوف سمجھتا ہے جو سری نگر اور سوپور کی گلیوں میں کیل کانٹے سے مسلح انڈین سپاہیوں کا صرف پتھروں کو ہتھیار بنا کر مقابلہ کر رہے ہیں اور کفِ افسوس ملتے ہوئے کہتا ہے کہ اس سے تو قیمتی کشمیری جانوں کا اور بھی زیادہ نقصان ہوگا مگر وہ اس لڑائی کے مقصد، یعنی آزادی کے مقصد کو بالکل جائز اور بجا مانتا ہے۔

بھارتی ریاست کے دعوے اور اصرار کے برعکس کشمیری آج اقتصادی ترقی کے لئے سڑکوں پر احتجاج نہیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے دو دہائیاں پہلے بہتر مکانوں، سرکاری ملازمتوں، تارکول بچھی سڑکوں اور بجلی کی باقاعدہ ترسیل کے لئے مسلح جدوجہد شروع نہیں کی تھی۔ کشمیر کی سیاحت کے لئے آنے والوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، کہ بھارت کے دیہی علاقوں کا بیشتر حصہ جس غربت تلے دبا ہوا ہے وہ کشمیر میں بمشکل ہی کہیں دکھائی دیتی ہے..... ہر کسی کے پاس ایک مکان اور کم از کم ایک قطعۂ اراضی ضرور موجود ہے اور وہ جسے ''انڈیا'' کہتے ہیں اس کی بہ نسبت یہاں کے لوگ زیادہ صحتمند اور بہتر غذائیں کھانے والے

ہیں ..... اور باوجود ان دو عشروں کے جنگ و جدل کے بھی، جس نے مقامی معیشت کو تباہ و برباد کر رکھا ہے، یہاں خوشحالی دکھائی دے رہی ہے۔ انّا دکّا جو بھکاری سری نگر میں نظر آ جاتے ہیں سیاہی مائل رنگت کے ''انڈین'' ہیں جو بہار، راجستھان اور اتر پردیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیہی کشمیر کے پہاڑوں میں دشوار گزار راستوں پر پُرخطر کاموں میں جُتے ہوئے غلاموں کی طرح ٹولیوں کی شکل میں کام کرنے والے، چھوٹی چھوٹی اوپر کو اٹھی ہوئی ناکوں والے مرد اور عورتیں زیادہ تر چھوٹا ناگپور کے ''ہو'' اور ''سنتھال آدی واسی'' ہیں۔ سری نگر اونچی اونچی عالی شان عمارتوں سے بھرا پڑا ہے جن کا نئی دہلی کے بیشتر پوش علاقوں میں بھی تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب کچھ بلاوجہ نہیں ہے کہ کشمیر پر، جسے بھارت کی انتہائی کرپٹ ریاستوں میں شمار کیا جاتا ہے، عنایات کی بارش کی جا رہی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا یہاں کے لوگوں کی وفاداریاں خریدنا چاہتی ہے۔ ان پُرتعیش مکانات اور بنگلوں کے باسیوں کی جیبیں ہمیشہ نوٹوں سے بھری رہتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ کشمیر میں غریب لوگ بھی رہتے ہیں لیکن کشمیری عموماً اتنے فلاکت زدہ نہیں جتنے کہ ان بڑے بڑے علاقوں میں غریب رہتے ہیں جنہیں یہاں کے لوگ ''انڈیا'' کہتے ہیں۔ اس صورت حال میں انہیں دیئے جانے والے قرضوں اور گرانٹس کی مقدار اور گورنمنٹ آف انڈیا کے فنڈز سے جاری منصوبوں کی تعداد خواہ کتنی ہی بڑھا دی جائے کشمیری مسلمانوں کی بھارت سے آزادی کی خواہش کی شدّت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔ انعام و اکرام کی یہ بارش ''کشمیریوں کے دل جیتنے'' کی مُہم کا حصہ ہے۔ بھارتی سیاستدان اور صحافی اس کے لئے عموماً یہی فقرہ استعمال کرتے ہیں۔ کشمیریوں کی آرزوئے آزادی پر ان شدید وارننگز کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ خودمختار کشمیر خوشحال تو کجا اپنی اقتصادی زندگی بھی برقرار نہیں رکھ سکے گا اور اگر پاکستان میں شامل ہو گیا تو یقیناً ایک نہ ختم ہونے والے معاشی بحران میں پھنس جائے گا۔

> ''انسان صرف روٹی کھانے سے زندہ نہیں رہتا''، سلیم میری ان باتوں کا جواب دیتے ہوئے دانشورانہ انداز میں بائیبل کا یہ جُملہ یاد دلاتا ہے پھر کہتا ہے: ''انسان کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا کہ وہ ساری دنیا حاصل کر لے اور اپنی

MashalBooks.org

رُوح سے محروم ہو جائے''

اگر یہ سب روزگار کی کمی یا بے پناہ غربت کی وجہ سے نہیں کہ بہت سے کشمیری مسلمان انڈیا سے آزادی کا خواب دیکھتے چلے آ رہے ہیں، پھر یہ کیا چیز ہے جو انہیں دنیا کی طاقتور ترین افواج میں شمار ہونے والی ایک فوج کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والی جنگ کی طرف دھکیل رہی ہے جس میں اب تک وہ اپنے ایک لاکھ سے زائد افراد کھو چکے ہیں؟ میں نے کشمیر کے پورے مخمصے کو دو بنیادی عوامل کے اندر سمو دیا ہے۔ ایک طرف نیشنل ازم سے متعلق متضاد حکایتیں، دعوے اور مطالبات ہیں اور دوسری جانب مذہب کے حوالے سے حکایتیں، دعوے اور مطالبات ہیں۔ نیشنل ازم اور مذاہب اپنے اندر کلیّت رکھتے ہیں..... (جو کشمیر اور انڈیا میں بہت نمایاں ہیں)..... یہ کلیّت پسندانہ (Totalitarian) شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ ایسے نظریات ہیں جو مصالحت کے قائل نہ ہوں وہ اپنے تخیّلاتی ''دشمنوں'' کو جو اپنے قومی اور (یا) مذہبی وجود کی ایک خاص شناخت تعمیر کرنا چاہتے ہوں اور اس کا سامان بھی مہیا کر چکے ہوں، ناقابل برداشت سمجھتے ہیں۔

کشمیری مسلمانوں کی تاریخ کے ایک مطالعے کے مطابق وادیٔ کشمیر کے اصل باشندے اپنی ایک منفرد ثقافتی اور نسلی شناخت رکھتے ہیں۔ یہ شناخت مطالبہ کرتی ہے کہ اس کا اظہار سیاسی شکل میں بطور ایک 'خودمختار کشمیری ریاست' ہو۔ اس بیانیہ میں کشمیر کے بھارت کے ساتھ تاریخی اور ثقافتی روابط کو بعض اوقات (اور عمومی طور پر) بادلِ نخواستہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر انہیں محض ذیلی یا ضمنی تعلقات سمجھا جاتا ہے جو کہ صدیاں گزر جانے کی وجہ سے اس وقت مزید ماند پڑ گئے جب کشمیریوں کی بہت بڑی تعداد ہندومت، بدھ مت اور دیگر متنوع مقامی طور طریقوں اور رسموں کو ترک کر کے مسلمان ہو گئی۔ آزاد و خودمختار کشمیر کا مطالبہ اس تاریخ تصور سے بھی جنم لیتا ہے کہ وہ صدیوں دوسروں کے محکوم رہے، کبھی مغلوں کے، کبھی پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں کی رعایا کے طور پر رہے اور اب کچھ بھارتیوں کے اور کچھ نام نہاد ''آزاد'' کشمیر میں پاکستانیوں کے محکوم ہو گئے ہیں۔ یہ وہ مطالبہ بھی ہے جو تقسیم ہند کی منطق پر مبنی ہے۔ یہ کشمیریوں کے ساتھ سنجیدگی سے کئے گئے اس وعدے کی بھی مسلسل یاد دلاتا رہتا ہے جو کسی اور نے نہیں بلکہ بھارت کے پہلے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے کیا

تھا اور کہا تھا کہ بھارت اقوام متحدہ کے ساتھ کئے گئے اپنے اس عہد کا احترام کرے گا کہ کشمیریوں کو اپنے سیاسی مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ وہ وعدہ تھا جس پر بھارت ساٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی عمل کرنے میں ناکام رہا، باوجودیکہ وہ فاتحانہ انداز میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کے بلند بانگ دعوے کرنے سے نہیں تھکتا۔

دوسری جانب بھارت کی قوم پرستانہ داستان گوئی کی روشنی میں الگ کشمیری قوم کے بطور ایک سیاسی وجود کے لئے کوئی گنجائش نہیں، وہ یہ مطالبہ کرتی ہے کہ کشمیریوں پر خواہ جبر بھی کرنا پڑے ان سے منوا لیا جائے کہ وہ اپنے شناخت بطور بھارتی باشندے کرائیں اور یہ کہ ان کی سرزمین بھارت کا اٹوٹ انگ اور اس کا ناقابل تقسیم حصہ ہے۔ دونوں نیشنل ازموں کا کوئی نقطۂ اتصال نہیں اور دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کو ذرّہ بھر رعایت دینے کا بھی ارادہ نہیں رکھتا۔

مذہب اور مذہب پر مبنی شناخت کے متضاد مفاہیم بہت سے کشمیری مسلمانوں کے انڈیا سے آزاد ہونے کی خواہش کی اہم بنیاد ہیں۔ یہ اپنے اپنے طور پر اسلام کے عام مفہوم میں تصورِ مذہبی مغائرت(religious other) کے ساتھ لاینحل طور پر منسلک ہیں۔ اس تصور کی مثبت اور آبرومندانہ طریقے سے توجیہہ کی جاسکتی ہے لیکن وہ عام روش سے منحرف، صوفیوں اور تجدّد پسندوں کی آواز سمجھی جاتی ہے جو الگ تھلگ رہنے کے عادی چلے آرہے ہیں اور انہیں اکثر طنزاً گمراہ اور غیر معتبر ٹھہرایا جاتا ہے۔ مسلم افکار میں مذہبی مغائرت کا غالب مفہوم (عالمی طور پر، نہ کہ صرف کشمیر میں) بے حد نامعقول اور قابل ملامت ہے۔ غیر مسلموں کو عموماً ''کافر'' کہا جاتا ہے جس سے مراد غیر کشید کردہ جُھوٹ کے پیروکار اور خدا اور اسلام کے دشمن ہیں جن کی سزا ہمیشہ کے لئے نارِ جہنم ہے۔

کشمیر میں جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور وہابی اہل حدیثوں نے حالیہ برسوں میں جو اسلام کا قدامت پسندانہ اور فوقیت پر مبنی نقطۂ نظر پھیلایا ہے اس سے ان اختصاصی رجحانات اور تصورات میں مزید شدت پیدا ہوگئی ہے۔ ایسی تحریکوں سے وابستہ یا متاثرہ افراد میں سے بہت سے مسلمان، ہندوؤں (اور دیگر غیر مسلموں) کو گمراہ اور منکرینِ خدا، یا

MashalBooks.org

اس تعریف کے حوالے سے دشمنانِ اسلام قرار دیتے ہیں جو مل جُل کر مبیّنہ طور پر اہل ایمان کے خلاف عالمی سازش میں مصروف ہیں۔ غیر مسلموں کے ساتھ سماجی میل جول رکھنا اور ان کے طور طریقوں پر چلنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور اکثر بہت سے کیسوں میں اس کی سخت مذمت کی گئی ہے کیونکہ اس سے ان کے نزدیک مسلمانوں کا جذبۂ حُب اسلام کم پڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلام کے اس عالمی نقطۂ نظر کے حامیوں کے خیال میں بہترین طرز عمل یہ ہے کہ اس کی متبعین لازماً دوسروں کو مغلوب رکھیں، اس کے علمبرداروں کا اصرار ہے کہ اسلام دنیا پر حکمرانی کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ کشمیری مسلمان جو وسیع تر بھارت کا حصہ ہیں، اس کے اندر رہنے والے یکساں حقوق کے حامل دیگر مذاہب کو اس نظریۂ عالم کے تحت قابل لعنت و ملامت سمجھتے ہوں۔

ایسے اختصاصی رجحانات کو جدید ذرائع ابلاغ نے مزید فروغ دیا ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کی خبروں کو فوراً دنیا بھر میں پہنچا دیتے ہیں، اسی طرح لازماً یہ خود انڈیا میں پھیل جاتی ہیں جہاں لوگ اکثر دوسروں کے ہاتھوں مختلف قسم کے امتیازات اور تشدد کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ بھارت کے دیگر حصوں میں مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک کے ہر واقعے میں ملوث ہندو شاونسٹوں کی اکثر ریاستی ایجنسیوں کے ساتھ ساز باز ہوتی ہے جس کی وجہ سے کشمیری مسلمانوں میں بھارت سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش تیز تر ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی دیگر مذاہب کے لوگوں بالخصوص ہندوؤں کی منفی سوچوں کو بھی تقویت ملتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قرین قیاس لگتی ہے کہ اگر حکومت بھارت مسلمانوں کے خلاف گلا پھاڑ کر تعصب پھیلانے والے ہندو شاونسٹ گروہوں کے خلاف شروع ہی سے مربوط پالیسی اختیار کئے رکھتی (معلوم نہیں اس نے ایسا کیوں نہیں کیا، اس طرح اس کے سیکولر دعووں کی صداقت کا اظہار ہوتا) تو کشمیری مسلمانوں کا عمومی تصورِ بھارت اور تصورِ ہندو اتنا مخالفانہ نہ ہوتا جتنا کہ اب ہو چکا ہے۔

علاوہ ازیں کشمیری مسلمانوں کو تشدد کے ذریعے دبانے کے لئے بھارتی حکومت کی ہر کوشش (جو اخباری رپورٹوں کے مطابق بدستور جاری ہے) بھارت کی مخالفت میں مزید اضافہ کرتی ہے اور ہندوؤں کے بارے میں اختصاصی نظریات مزید سخت ہو جاتے ہیں جس

سے پُرامن مصالحت کے امکانات اور بھی زیادہ دور دکھائی دینے لگتے ہیں لیکن توازن کو درست کرنے کے لئے یہ بھی سچ ہے کہ عام ہندو تصور میں مذہبی مغائرت (religious other) کی حیثیت شک و شبہے سے ہرگز مبرا نہیں ہے۔ مجھے سال ہا سال ایسے ہندو واقف کاروں کے زہریلے جُملوں سے سابقہ پڑتا رہا جن کے پاس مسلمانوں کے لئے انتہائی گندی زبان کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ڈوڈہ میں، جو جموں و کشمیر کا واحد ضلع ہے جہاں ہندو اور مسلمان تقریباً برابر تعداد میں ہیں، میں وہاں ''ہندو مسلم تعلقات'' پر تحقیق کے لئے گیا ہوا تھا، وہاں مجھے بے شمار خودساختہ سادھوؤں سے ملنے کا موقع ملا (یہ حیرت کی بات تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مقامی نہیں تھا، تقریباً سبھی کا تعلق اتر پردیش اور بہار کے مفلس حصوں سے تھا) ان میں سے چند قابل ذکر افراد کے سوا سب کا یکساں طور پر کہنا تھا کہ مسلمان نجس ہیں یہ گائے ذبح کرنے والے شیطان ہیں، ہندوؤں کو ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہئے۔ ان میں سے زیادہ تر ان مقامی ہندوؤں کا ذکر بھی تلخی سے کرتے جن کے مسلمان اڑوسیوں پڑوسیوں کے ساتھ صدیوں سے اچھے تعلقات چلے آ رہے تھے۔ اس طرح جموں و کشمیر میں مذہبی مغائرت (مذہبی ''دوسرے'') کے بارے میں منفی رویئے کسی صورت میں تنہا مسلمانوں کی اجارہ داری نہیں ہیں۔

کشمیر میں جن مسلمان نظریہ پرستوں سے مجھے ملاقاتوں کا موقع ملا، ان کا اصرار تھا کہ کشمیر میں جاری کشمکش سیاسی نہیں، بلکہ (وہ حیرت انگیز طور پر ہندو شاونسٹوں کی تکرار کرتے ہیں) یہ سب کچھ مذہب کے بارے میں ہے یا وہ اسے جہاد کا نام دیتے ہیں۔ چند برس پہلے میں نے کشمیر ایک ممتاز اسلامی نظریہ پرست سیّد علی گیلانی سے انٹرویو لیا تھا (سری نگر کی گلیوں میں احتجاجی جلوس نکالنے والوں کے لئے ان کے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے ہیں) وہ کہہ رہے تھے کہ کشمیر میں چپقلش دراصل اسلام اور کفر کے مابین ہے قدرتی بات ہے کہ جب جنگ ایسے کائناتی پیمانے پر ہو رہی ہو تو مصالحت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ گیلانی نے دعویٰ کیا ''کسی مسلمان کا غیر مسلموں کی اکثریت والے معاشرے میں رہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ مچھلی کا پانی سے باہر رہنا مشکل ہوتا ہے۔'' انہوں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کشمیری مسلمانوں کے انڈیا کے ساتھ رہنے کی اجازت

نہیں دے سکتا بلکہ وہ ہندو اکثریت والے انڈیا سے علیحدگی اور ''اسلامی ریاست'' کے قیام کے لئے جدوجہد جاری رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ جب میں نے دوسرے ممالک میں ایسی ریاستوں کے قیام کی ناکامی کا ذکر کیا تو انہوں نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ''جن لوگوں نے ایسی کوششیں کیں ممکن ہے کہ وہ ناکام رہے ہوں مگر انہوں نے جدوجہد تو کی ہے۔ ہم کشمیری مسلمان اپنے ایمان کے تقاضوں کے تحت ایسا کرنے کے پابند ہیں۔''

میں نے کہا: ''مگر جموں وکشمیر کے ان غیر مسلموں کے بارے میں کیا خیال ہے جو ریاست کا تقریباً نصف حصہ ہیں؟ اور وہ یقیناً اسلامی ریاست کے پُر جوش حامی نہیں ہیں۔'' گیلانی فوراً بولے: ''وہ واقعی ہماری حمایت کریں گے بشرطیکہ ہم صحیح طریقے سے انہیں ایسی ریاست کے حُسن کے قائل کر دیں۔ اسلامی ریاست میں، امید ہے کہ تمام کمیونٹیز کو ان کے حقوق ملیں گے اور وہ سب خوش رہیں گے، وہاں اقلیتوں کے ساتھ کامل انصاف ہو گا۔ ہندوؤں کی اکثریت والے انڈیا جیسا حال نہیں ہو گا جہاں مسلمان طرح طرح کی مشکلات برداشت کر رہے ہیں۔''

جب میں نے یہی سوال جماعت اسلامی جموں وکشمیر کے جموں یونٹ کے سابق سربراہ مرحوم سعد اللہ تنتری سے پوچھا تو انہوں نے چبھتا ہوا جوابی فقرہ کہا (جس کے بارے میں میرا شبہ ہے کہ انہوں نے اس کی کئی بار مشق کر رکھی ہو گی) ''ہم جس اسلامی ریاست کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں وہ ثابت کر دے گی کہ وہ ہماری ریاست کے ہندوؤں کے لئے ایک رحمت ہو گی، یہ بالکل ایسی ہو گی کہ انڈیا کے دوسرے حصوں کے لوگ بھی یہاں آ کر جمع ہونے کے آرزومند ہو جائیں گے۔''

اس سلسلے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، ایسا کوئی امکان نہیں کہ غیر مسلم ایسے متقیّانہ دعووں کو سنجیدگی سے لیں گے۔ اسلامی انقلاب کے نظریہ سازوں کی جو تحریریں اسلام کی مسخ شدہ تعبیر پر مبنی ہیں، ان میں غیر مسلموں (جنہیں دوسرے درجے کی رعایا سے بہتر نہیں سمجھا جاتا) کی حیثیت کے بارے میں کئے گئے دعووں کو بہت سی مسلم ریاستوں میں ان کے حالات کی روشنی میں دیکھا جانا چاہئے کہ وہاں غیر مسلم اقلیتوں سے کیا برتاؤ کیا جاتا ہے، ان میں وہ ریاستیں بھی شامل ہیں جو دوسرے مسلم ممالک سے زیادہ مذہبی میلان رکھتی

ہیں۔ (اس کی مثالیں سعودی عرب، پاکستان اور طالبان کے دور کا افغانستان ہیں، مؤخر الذکر اس سلسلے میں زیادہ خراب شہرت رکھتا ہے) یہ صورت احوال غیر مسلموں کو گیلانی اور تنزی جیسے لیڈروں کے وعدوں کی مزید جانچ پڑتال کے چکر میں پڑنے سے خود بخود روک دیتی ہے۔

جموں کے ہندوؤں، لیہہ کے بودھوں (اور غالباً کارگل میں شیعہ اکثریت) کی طرف سے انڈیا سے علیحدگی کی شدید مخالفت کے باوجود خود مختار کشمیر کے علمبردار، ریاست کی واحد نمائندہ آواز ہونے کا کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں، ان کی اس جسارت پر مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی رہی ہے۔ گیلانی اور دیگر اسلام پسند کشمیری لیڈر مسلسل دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ وہ جموں اور کشمیر کی پوری ریاست کو (بشمول ہندو اکثریت کے جموں اور بودھ اکثریت کے لیہہ کے) انڈیا سے الگ کر کے اسے ایک خود مختار ''اسلامی ریاست'' جموں و کشمیر کا حصہ بنائیں گے یا پاکستان میں شامل ہو جائیں گے۔ وہ حیرت انگیز طور پر اس سلسلے میں اپنے موقف میں تناقض کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ ایک طرف وہ اس چیز کی مخالفت کر رہے ہیں جسے وہ کشمیر میں، ہندو انڈین استعماریت کہتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس چیز کے چیمپئین بن رہے ہیں جو جموں و کشمیر کے غیر مسلموں اور غیر نسلی کشمیریوں کے نقطۂ نظر سے مسلم کشمیری استعماریت ہو گی۔

ایسا نہیں ہو سکتا کہ ''اپ کباب بھی چبائیں اور بکری کو بھی سلامت رکھیں۔ کوئی تو انہیں بتائے کہ آرام سے زندگی گزارنے کے لئے کیا اب اس استعارے کو نئی شکل دینی پڑے گی۔

انڈین میڈیا کے بعض ارکان جو کچھ پیش کر رہے ہیں، حالات اس کے برعکس ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ گیلانی اور لشکر طیبہ جیسے انقلابیوں کے پروگراموں سے کشمیری مسلمانوں میں کوئی اتفاق رائے پایا جاتا ہو۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ بہت کم لوگ طالبان یا جماعت اسلامی جیسے لوگوں کی حکمرانی کو پسند کریں گے۔ میں بیسیوں کشمیریوں اور باعمل مسلمانوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جن کا اصرار ہے کہ انقلابی اسلام پسندوں کا پیش کردہ اسلام، حقیقی اسلام نہیں ہے۔ تاہم ان میں سے بہت کم ایسی جرأت کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے ناموں سے پیش کئے

ہوئے دعووں یا انقلاب پسندوں کے پیش کئے ہوئے مذہب کے خلاف زبان کھولیں۔ کیونکہ ایسا کرنا اپنی جان کے ضیاع کا خطرہ مول لینا ہوگا۔ اسی طرح جیسے کشمیر کے بارے میں بھارتی ریاست کے دعووں کے خلاف بولنے پر ہزاروں بدقسمت کشمیری اپنی جانیں گنوا بیٹھے ہیں۔

اور اس طرح قوم پرستی اور مذہب سے متعلق متضاد بیانات کے پھندے اور کشمیر میں جاری تشدد کا سلسلہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک بنی نوعِ انسان بشری میل جول کے لئے کوئی واضح اور جامع بنیادیں مہیا نہیں کر لیتا۔

[9/اگست2010]

MashalBooks.org

خطرناک دشمن، اٹوٹ رشتے: یکساں مذہبی تعصّبات

میں پچھلے کئی برسوں سے جموں اور کشمیر کے وسیع سفر کرتا رہا ہوں اور زندگی کے مختلف شعبوں کے لوگوں سے میری ملاقاتیں رہی ہیں۔ میرا اوّلین مقصد خطّے میں لوگوں کے بدلتے رنگوں اور ان کی ذات و کردار پر مذہب کے اثرات کا جائزہ لینا تھا۔ اس آمدورفت کے دوران میں اس حقیقت سے دو چار ہوا کہ مذاہب کی رنگا رنگ تعبیریں کی جاتی ہیں اور ان کو ایسے ایسے معنے پہنائے جاتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں ''ہندوؤں''، ''مسلمانوں'' اور ''بدھسٹوں'' کے جو سادہ اور عام فہم تصورات تھے، نئی تعبیریں انہیں مکمل طور پر جھٹلا رہی ہیں۔

میں چونکہ مختلف مذاہب کے لوگوں (اور بالکل لامذہبوں سمیت) کے پُرامن بقائے باہمی کا پُر جوش حامی ہوں، اس لئے میں لوگوں کی مذہب سے مفہوم اخذ کرنے کی صلاحیت سے آگاہی اور دینی اعتقادات کی حقیقت جاننے میں خاص طور پر دلچسپی لیتا رہا ہوں۔ تاکہ اسے بروئے کار لا کر نفرت کی سیاست اور مذہب کے نام پر بٹوارے کے خلاف لڑا جا سکے۔ اور میں نے جموں و کشمیر کے متعدد بار کے سفر میں بے شمار لوگوں سے اس مسئلے پر تبادلہ خیال کیا ''عام لوگوں'' نے اس پر اگرچہ اپنے اپنے طریقے پر اظہار رائے کیا مگر اس سے کافی حد تک امید بندھی ہے کہ فرقہ واریت کے یلغار پر بالآخر قابو پا لیا جائے گا۔ ساتھ ساتھ اس امید کو خاک میں ملانے کی کوششیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں۔ تاہم مجھے ان طریقوں پر بھی حیرت ہوتی ہے جو جموں و کشمیر اور دیگر مقامات پر ایک کمیونٹی کو دوسری کمیونٹی کے خلاف صف آرا کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں اور مذہب کو سیاسی ایجنڈے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

چند سال قبل جب میں جموں ڈویژن کے ضلع ڈوڈہ میں سفر کر رہا تھا وہاں مجھے ایک

آتش نوا اسلام پسند سے متعارف کرایا گیا، وہ ایک کم معروف ایک حامیٔ پاکستان گروہ سے تعلق رکھتا تھا، بستر سے لگا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس یہ چند مہینوں کا مہمان ہے۔ صرف خود ہی کو راہِ راست پر سمجھنے والا یہ بدمزاج شخص مغلوب الغضب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''مسئلہ کشمیر مذہبی بھی ہے اور سیاسی بھی۔ اسلام میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔'' اس خیال کی حمایت میں اس نے شاعر علامہ اقبال کا ایک شعر پڑھا: ''جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' پھر اس نے کہا کہ گاندھی کا بھی کم و بیش یہی دعویٰ تھا۔ اسے اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا کہ دنیا کے گوناگوں مصائب کا دیرپا حل اس میں ہے کہ ہر کوئی اسلام قبول کر لے۔ (یعنی یہ اس کا نقطۂ نظر تھا) کیا دوسرے بھی دلی طور پر یہی چاہتے تھے کہ ایک عالمی اسلامی ریاست بن جائے جس سے تنازعہ کشمیر کا بھی مستقل حل نکل آئے؟

یہ شخص، اپنے بقول جوانی میں ایک پُرجوش لیفٹسٹ تھا لیکن بعد میں جنوبی ایشیا کی اسلامی خیالات رکھنے والی ایک بڑی تنظیم، جماعت اسلامی کے بانی سیّد ابو الاعلیٰ کی تصانیف پڑھنے کے بعد اس نے ''اپنے طور طریقے'' بدل لئے۔ اب وہ یہ ایمان رکھتا ہے کہ اس کی باقیماندہ زندگی کشمیر میں ''اسلامی ریاست'' کے قائم کرنے کی جدوجہد میں گزر جائے۔ ویسی اسلامی ریاست جیسی مولانا مودودی چاہتے تھے۔ خواہ اس کے لئے ہندوستانیوں کو نکالنے کے لئے جنگ کیوں نہ کرنی پڑے۔ اپنے ان خیالات اور جدوجہد کی بنا پر اسے اپنی زندگی کا ایک خاص حصہ بھارت کی کئی جیلوں میں گزارنا پڑا۔

میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا کہ پیغمبر اسلام نے مکہ میں اپنا پیغام پھیلانے کے لئے کئی سال پُرامن جدوجہد کی، اس کے بہت بعد جا کر جب وہ ہجرت پر مجبور ہو کر مدینہ پہنچے تو ان کے مکّی مخالفین نے انہیں وہاں بھی سکون سے نہ رہنے دیا، تب انہوں نے اپنے پیروکاروں کو ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی۔ مزید برآں انہوں نے مدینہ میں اپنی سیاسی مملکت کی تعمیر کے لئے بھی اسلحے کی طاقت استعمال نہیں کی تھی۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ کشمیر میں اس قسم کی ریاست کے قیام کے لئے طاقت کے استعمال کی شاید اسلام سے اجازت نہیں ملے گی؟

MashalBooks.org

مجھے معلوم تھا کہ بہت سے دیگر کشمیری مسلم سکالرز اور دیگر مقامات کے متعدد مسلمان سکالرز کی طرف سے اس کا بالکل مختلف جواب ہوگا۔ مسلّح جہاد یعنی راہِ خدا میں عملی جدّ وجہد کے حق میں ان کا پُر اصرار جواب یہ ہوگا کہ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب مسلمانوں پر ظُلم ہو رہا ہو یا جب انہیں مذہبی آزادی سے محروم کر دیا گیا ہو۔ یا شاید انہیں صرف اس وقت جہاد کی اجازت ملے گی جب اس راستے سے انہیں حاصل ہونے والے امکانی فوائد اس سے اٹھائے جانے والے نقصان سے زیادہ ہوں۔ ان سکالرز میں سے بعض کی طرف سے یہ دلیل دی جائے گی کہ جموں اور کشمیر میں ایسی صورتِ حال ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے جرأت کرتے ہوئے اس سے یہ پوچھ لیا کہ اگرچہ کشمیر میں جاری تحریک کو ایک سیاسی جدوجہد کہا جا سکتا ہے لیکن اس پر جہاد کا لیبل لگانا شاید درست نہیں ہے؟

اس نے گرجدار آواز میں جواب دیتے ہوئے کہا: ''انڈین گورنمنٹ نے ہماری مذہبی آزادیاں ہم سے چھین رکھی ہیں۔''

میں نے کہا: لیکن مسجدیں اور مدرسے، اور اسی طرح مسلم تنظیمیں مع اس کی اپنی تنظیم کے، آزادی سے کام کر رہی ہیں پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کشمیری مسلمان اپنے مذہبی حقوق سے محروم ہیں؟

اس نے ایک لمحہ بھر توقف کیا اور اپنے پاؤں پر کھلے ہوئے ایک زخم کو سہلانے اور متفکرانہ انداز میں داڑھی کھجلانے کے بعد جواب دیا ''کشمیر کے اسلامی مدرسوں میں حکومت کا منظور شدہ نصاب جبراً لگوا دیا گیا ہے، اس میں بہت سا مواد مسلم دشمنی پر مبنی ہے اور بعض اوقات ہمیں جلوس نکالنے کی بھی آزادی نہیں دی جاتی۔

اس کا پہلا الزام، جہاں تک مجھے معلوم ہے، بالکل بوگس تھا اور اگر اس کے دوسرے الزام میں کچھ صداقت تھی وہ ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر نہیں کیونکہ بیسیوں دیگر مسلم گروپوں کو بشمول پُر امن مشنری کام کرنے والوں کے، ایسی پابندیوں کا سامنا نہیں ہے۔

یہ شخص ایک سخت گیر اسلامی نظریئے کا علم اٹھائے ہوئے ہے، اس خطّے میں اسلام کی غالب شکل صوفی ازم کا شدید طور پر مخالف ہے، جس نے ایسی منفرد ثقافتی روایت قائم کی کہ اس کی بدولت مسلمان ہندو اور دیگر مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے قریب تر آ

گئے۔ وہ اس وقت بھی پیسجنے سے انکاری رہا جب میں نے کہا کہ یہ صرف صوفیا کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام نہ صرف کشمیر میں بلکہ باقی ماندہ جنوبی ایشیا میں بھی پھیلا ہے۔ اس پر اس نے برافروختہ ہوتے ہوئے کہا کہ صوفی ازم بالکل غیر اسلامی ہے اس نے جذبۂ جہاد کو ٹھنڈا کیا اور مسلمانوں کو ان سیاسی بلندیوں سے نیچے گرایا جہاں وہ پہلے پہنچے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو ان مٹھی بھر ارکانِ اشرافیہ کے رہنما کے طور پر محسوس کر رہا تھا جن کا مشن مسلمانوں کو ان خیالات سے پاک کرنا تھا جو ان کے کافرانہ ماضی کی باقیات میں سے تھے۔ اس نے کہا کہ ''کشمیری مسلمانوں میں سے صرف پانچ فیصد سچے مسلمان ہیں باقیماندہ مسلمان صوفی ازم کے سحر میں مبتلا ہیں اور بہت سے دلی طور پر اب بھی ہندو ہیں۔ صوفی صرف لوگوں کے ناموں کو تبدیل کرتے ہیں لیکن ان کے کردار کو اسلام کی صحیح سمت کی طرف نہیں لاتے۔'' اس نے غصیلے انداز میں کہا۔

اس کی صوفی ازم اور کشمیر میں صوفیوں کے کردار کے بارے میں لاعلمی حیرت انگیز تھی مگر میں نے اس نقطے کو اپنے تک محدود رکھا۔ ایسا نہیں کہ اس کے تندوتیز جملے میرے لئے باعثِ صدمہ تھے، کیونکہ میں اس کے وہابی نظریئے کے جوش وخروش کے بارے میں پہلے سن چکا تھا اور وہ ویسا ہی ثابت ہوا جیسے میں نے توقع قائم کر رکھی تھی۔ لیکن جس چیز نے مجھے خاص طور پر فکر مند کیا وہ یہ تھی کہ یہ انتہا پسندانہ اسلامسٹ سٹائل سیاست کا ایک پُر جوش وکیل ''ہندوتوا'' کا کیسے خفیہ ہمدرد بن گیا ہے، اگرچہ کچھ الجھے ہوئے انداز میں اس کا ہمنوا بنا ہے۔ یہ بات مجھ پر اس وقت منکشف ہونا شروع ہوئی جب میں نے اس سے یہ پوچھا کہ اگر آپ کا اصرار ہے کہ کشمیر میں مسلم اکثریت کو اسلامی ریاست، میں تبدیل کر دیا جائے تو آپ بھارت میں ہندو اکثریت کو اس سے کیسے باز رکھیں گے کہ وہ اس کو ایک ہندو ریاست بنا دے؟

اس نے جھٹ سے جواب دیا ''انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔'' میں یہ سن کر ششدر رہ گیا مگر اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''کوئی بھی مذہب، حتیٰ کہ ہندوازم بھی، سیکولرازم سے بہتر ہے کیونکہ یہ لادینیت ہے اور مذہب کو کلیتًا مسترد کر دینے کے مترادف ہے لہٰذا ہندو ریاست، ایک لادین ریاست سے بہتر ہے۔'' دلچسپ بات یہ

ہے کہ یہی سوال ایک بار اس شخص کے مربیّ سیّد مودودی سے پوچھا گیا تو ان کا جواب بھی بالکل یہی تھا۔

اس نے اپنے بیان کی قطعیت کو کمزور کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ''اسلام کے سوا تمام دیگر مذاہب نامکمل ہیں، ان کے اندر پورا نظام موجود نہیں ہے جو کہ ریاست کے تمام امور پر حاوی ہو۔ اس لئے اگر ہندو بھارت کے اندر ہندو راج لانے کی کوشش کریں تو انہیں خود پتہ چل جائے گا کہ یہ کام نہیں دیتا، ہم مسلمان انہیں ایک ایسا نظریہ فراہم کر سکتے ہیں جو ان کی اس ضرورت کو پوری کر سکتا ہے۔''

اس شخص سے بھی زیادہ بے ڈھنگی اور ڈراؤنی چیز (اگر اس کا تصور باندھا جا سکتا ہو) وہ ایک چھوٹے قد والا سیاہ رُو، بڑھی ہوئی توند والا، گیروے کپڑے پہنے ہوئے بزعم خود ایک ہندو ''سادھو'' تھا، میں اسی سفر میں اس سے ضلع ڈودہ میں ملا تھا، وہ خود کو ''مہنت'' یا ایک چھوٹے مندر کا سربراہ کہتا تھا۔ ڈودہ میں مندروں کے ایسے بہت سے دیگر سربراہوں کی طرح وہ شمالی اتر پردیش کے ایک گاؤں کا تھا اور راشٹر یا سیوک سنگھ (RSS) کا پُر جوش وکیل تھا، اس نے دس جماعتوں تک تعلیم حاصل کی تھی اور اپنے دعوے کے مطابق وہ ایودھیا میں سادھوؤں کے ایک مرکز میں رہا تھا اور تقریباً دس سال پہلے ڈوڈہ میں منتقل ہوا تھا۔

اس کی اور میری گفتگو ڈوڈا میں ہندو مسلم تعلقات کے گرد گھومتی رہی۔ وہ کہنے لگا: ''ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے کبھی دوست نہیں بن سکتے۔ وہ ایک دوسرے سے ''قطبین'' کے فاصلے پر رہنے والے ہیں۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا کہ ''ان کے درمیان کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔'' سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے مسلمانوں کے تولّد کے حوالے سے اپنا گھڑا ہوا خاص نظریہ پیش کیا کہ ''وہ فطری طور پر شر پسند ہیں، وہ کبھی ہندوؤں کے ساتھ امن سے نہیں رہ سکتے۔'' اس نے اپنے مندر میں آنے والے مقامی ہندوؤں کو ہوشیاری سے یہ پیغام دیا ''میں ان سے کہتا ہوں کہ اپنے مذہب پر ڈٹے رہو اور مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کم سے کم رکھو۔'' اس نے اس امید پر میری طرف دیکھا کہ کیا میں اس سے متفق ہوں۔

اسے یقیناً اس سے مایوسی ہوئی ہوگی۔ تاہم اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا

MashalBooks.org

''سب مسلمانوں کو ان کے بوریا بستر سمیت پاکستان میں دھکیل دو اور بھارت کو ہندو ریاست قرار دے دو۔'' اس کے پاس ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ناقابل حل اختلافات کا بس یہی ایک حل تھا۔

جس طرح متذکرہ بالا خود ساختہ اسلام پسند شخص، صوفی روایت سے منسلک کثیر التعداد لوگوں کو بمشکل مسلمان ماننے پر تیار تھا، اس لئے وہ مداخلت کرنے کی اشد ضرورت محسوس کرتا تھا، اسی طرح ڈوڈہ کا وہ خود ساختہ ہندو سادھو ڈوڈہ کے ہندوؤں کو ''آدھے مسلمان'' اور ''نامناسب ہندو'' قرار دیتے ہوئے اپنی رہنمائی کے محتاج سمجھتا تھا ''یہ ماس کھاتے ہیں اور مسلمانوں کی طرح اپنے قریبی رشتوں کے ساتھ شادی رچا لیتے ہیں۔'' اس نے سخت بیزاری کے ساتھ کہا: ''یہ ایک مسلمان فقیر شاہ فرید الدین کے مزار پر جاتے ہیں اور مسلمانوں کے گھروں کا کھانا کھاتے ہیں۔'' یہ سب کچھ مکمل طور پر غیر ہندووانہ ہے۔'' اُس خود ساختہ اسلام پسند کی طرح اس شخص کا دھرم تھا کہ سوائے اس کے اپنے مذہب کے کسی مذہب میں کوئی اچھائی نہیں پائی جاتی۔ ''صرف ہندو مذہب سنت اور مہاتما پیدا کرتا ہے۔'' اور اس نے دعویٰ کیا کہ ''صرف چند ایک مسلمان ہی کبیر اور رحیم جیسا مقام حاصل کر پاتے ہیں اور وہ بھی اس وقت حاصل کر سکے تھے جب وہ ہندو بن گئے تھے۔ مسلمان مذہب میں ذرّہ بھر بھی اچھائی نہیں پائی جاتی، اگر کوئی مسلمان مجھے چھو لے تو مجھے اس کے فوراً بعد اشنان کر لینا چاہئے تاکہ میں جلدی پوتّر ہو جاؤں۔ اگر مسلمان کوئی اچھا کام کر بھی لیں پھر بھی ان کی ناپاکی برقرار رہتی ہے، اسے ان کی جسموں سے رگڑ کر بھی نہیں اتارا جا سکتا۔''

میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا کہ کیا تم اس نتیجے پر اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد پہنچے ہو، تو اس نے جھجکتے ہوئے اعتراف کیا کہ اسے مسلم عقیدے کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ اس نے ایک بار پھر اپنی جہالت کا سچائی کے ساتھ اقرار کرتے ہوئے کہا ''ہمارے ہندو دھرم شاستروں میں سب سچائیاں موجود ہیں، ہم انہیں کہیں اور جا کر کیوں ڈھونڈیں؟''

یہ شخص جو خود کو خطّے کے تمام ہندوؤں کا نجات دہندہ سمجھتا تھا نہایت ڈھٹائی سے ذات پات کی حمایت کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے آپ کو ''شدھ برہمن'' سمجھتے ہوئے کہتا تھا کہ ''ذات پات کا نظام برہما جی کا بنا ہوا ہے دھرم شاستروں کا کہنا ہے کہ برہمن، دیوتاؤں سے

بھی زیادہ بلند مرتبہ رکھتا ہے خواہ برہمن کردار کے لحاظ سے کتنا ہی پست کیوں نہ ہو، وہ پھر بھی عبادت کے لائق ہوتا ہے۔ وہ اس گائے کی طرح ہے جو خواہ گوبر کھاتی ہو تب بھی اس کے سامنے دستِ دعا پھیلایا جا سکتا ہے۔ ایک شودر خواہ وہ کتنا ہی پرہیزگار اور لائق فائق ہو اسے اپنی پست حیثیت قبول کرتے ہوئے اونچی جاتیوں کی خدمت بجا لانی چاہئے۔ وہ عزت کے ہرگز قابل نہیں ہوتا بلکہ گدھے کی طرح ہوتا ہے، اس پر خواہ موتی لدے ہوں وہ گدھا ہی رہتا ہے، اسے گھوڑا نہیں بنایا جا سکتا۔

اس کی باتیں سن کر میرا جی چاہتا تھا کہ میں پھٹ جاؤں اور اس کے سامنے قے کر کے بھاگ جاؤں۔ میں اس کے جہالت اور تعصب کے نفرت انگیز مظاہرے پر بدحواس ہو گیا تاہم میں نے خود کو قابو میں رکھا جیسا کہ ایک خودساختہ اسلام پسند کے سامنے میں نے اپنے ہوش وحواس برقرار رکھے تھے۔ میں نے اُس میں اور اِس میں بہت سی باتیں مشترک پائیں۔ انہوں نے خود کو ایک دوسرے کا کتنا ہی بڑا دشمن ظاہر کیا ہو، لیکن اس کے باوجود ایک بنیادی سطح پر وہ ایک دوسرے کی اشد ضرورت کے حوالے سے آپس میں متحد ہیں۔ انہیں اپنی بقا، ایک جیسی ،متعصّبانہ زبان کے استعمال اور دنیا کو نفرت کے شیشے میں سے دیکھنے کا جواز پیش کرنا ہے۔

[16/اگست2008]

MashalBooks.org

کشمیر کی سیاست پر نئے سرے سے غور

بہت سے کشمیری مسلمان چلاّ چلاّ کر کہہ رہے ہیں کہ آزادئ کشمیر کے مطالبے کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور اصرار کرتے ہیں کہ کشمیر کے اندر اور اس کے بارے میں جو کشمکش برپا ہے وہ درحقیقت ایک ''سیاسی'' معاملہ ہے۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں وہ اس بات کو آسانی سے نظرانداز کر دیتے ہیں کہ مذہب اور سیاست کو (بالخصوص تنازعہ کشمیر کے حوالہ سے، جس میں کہ پاکستان کی مسلم اکثریت اور بھارت کی ہندو اکثریت ملوث ہیں) بمشکل ہی ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ مذہب اور اس کے حوالے سے قائم فرقہ وارانہ شناختوں کا جموں و کشمیر کے بنیادی مسئلے اور اس کی ہنوز غیر طے شدہ سیاسی حیثیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کشمیری قوم پرست، بے لچک موقف رکھنے والے اسلام پسندوں اور ''ہندوتوا'' بریگیڈ کے بالکل برعکس اس نقطے کو فوراً مسترد کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ شاونسٹ بنیاد پرست یا فرقہ پرست کہلانے کا لیبل لگنے سے خوفزدہ ہیں لیکن کشمیر کے اندر اور اس پر جاری کشمکش کے خدّ وخال کے تعین میں مذہب کے کردار کا مزید عرصے کے لئے انکار ممکن نہیں رہا۔

کشمیری قوم پرستوں کا اصرار ہے کہ ان کے خوابوں کے خود مختار کشمیر میں مذہبی اقلیتوں سکھوں، ہندوؤں اور بودھوں کو (جو کہ کل آبادی کی ایک تہائی سے زیادہ ہیں) مساوی حقوق حاصل ہو جائیں گے۔ ان کے لئے کوئی وجۂ شکایت نہیں ہو گی۔ بعض یہ ڈینگ بھی مارتے ہیں کہ انہیں اپنے منصوبے کے لئے غیر مسلموں کی حمایت حاصل ہے، لیکن اس کے لئے وہ کوئی شواہد سامنے نہیں لاتے۔ ساتھ ہی ساتھ جب وہ ڈوگرہ راج کی مذمت کرتے ہیں اور ریاست کے مسلمانوں کو طویل عرصے تک غلام بنائے رکھنے پر طعن و

تشنع کا نشانہ بناتے ہیں۔ تو دوسری طرف وہ ریاست جموں و کشمیر کی باؤنڈریز کو جو ڈوگرہ راج نے کشمیری مسلمانوں کی خواہشات کے برخلاف وضع کی تھیں انہیں مجوزہ خود مختار ملک کے لیے مقدس قرار دیتے ہیں۔ اگر ڈوگروں کا راج ناجائز اور غیر قانونی تھا تو اس کی کھینچی ہوئی ان باؤنڈریز میں کون سا تقدس باقی رہ جاتا ہے جن کی بدولت جموں لداخ اور بالکل مختلف وادیٔ کشمیر کو جبراً یونین میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اگر، جیسا کہ وہ بجا اصرار کرتے ہیں کہ جموں کے ڈوگروں نے کشمیر کو اس کی مرضی کے علی الرغم فتح کیا تھا تو اس جبری الحاق کو اس خود مختار جموں و کشمیر میں برقرار رکھنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے جس کا کشمیری قوم پرست خواب دیکھ رہے ہیں۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب جموں کے ہندو کشمیر کی مبینہ بالادستی کے خلاف نفرت کے جذبات رکھتے ہیں۔ جموں کے مسلمانوں میں بھی یہی جذبات پائے جاتے ہیں۔

تاہم کشمیری قوم پرست اپنی دلیل میں اس بنیادی تناقض کو تسلیم کرنے سے انکاری رہیں گے جس کا سبب بالکل واضح ہے۔ ایسا کرنا، یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جموں کے ہندو (اور لیہہ کے بودھ) ایک خود مختار جموں و کشمیر کے ایجنڈے کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔ یہ ایک اظہر من الشّمس لیکن ایک پریشان کن حقیقت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا کہ یہ ایجنڈا زیادہ تر کشمیری مسلمانوں کے مفادات اور آرزوؤں کی نمائندگی کرتا ہے اور باقی ماندہ ریاست پر کشمیر مسلم کنٹرول کو قانونی شکل دینے کا ایک ذریعہ ہے۔

یہاں قبل از تقسیم ہندوستان کی تمثیل مفید ہو گی۔ مسلم لیگ کا اصرار تھا کہ چونکہ ہندوستان کے ہندوؤں کو عددی اکثریت حاصل ہے ایک متحد اور آزاد ہندوستان مسلمانوں کو خواہ کتنے ہی تحفظات فراہم کرے غلبہ ہندوؤں کا ہی رہے گا اور وہ اپنے تمام سیکولر اور جمہوری دعووں کے باوجود بے لگام ہندو راج ہی کہلائے گا۔ اور یہی احساس ایک علیحدہ، ملک پاکستان کے مطالبے پر منتج ہوا۔ جموں کے ہندو اور لیہہ کے بودھ آج خود کو اسی حیثیت میں پاتے ہیں جس میں قبل از تقسیمِ ہند میں مسلم لیگ کے حامی اپنے آپ کو پاتے تھے۔ کشمیری قوم پرستوں کا اصرار ہے کہ وہ اسی طرح ایک خود مختار جموں و کشمیر چاہتے ہیں جیسا

MashalBooks.org

کانگریس اس وقت چاہتی تھی جب وہ ایک متحد اور آزاد ہندوستان کی بات کرتی تھی۔ اور جیسا کہ کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ کیا وہ جموں اور لیہہ کی اقلیتوں کے ساتھ وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے خوابوں کی اس ریاست میں ان کے حقوق کا مکمل تحفظ کیا جائے گا۔ تاہم جیسا کہ بہت سے مسلمانوں نے کانگریس کے وعدوں کو اس ڈر کی وجہ سے قبول نہ کیا کہ ان کا کبھی احترام نہیں کیا جائے گا، جموں اور کشمیر میں غیر مسلم اقلیتیں کشمیری قوم پرستوں کے دلائل سے اتفاق نہیں کرتیں جنہیں وہ بجا طور پر کشمیری بالادستی کے جواز پر پڑا ہوا باریک پردہ ڈالنے کی کوشش قرار دیتے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ کشمیری، بشمول میرے چند انتہائی قریبی دوستوں کے، مندرجہ بالا نقطے کی مخالفت میں بے حد اختراعانہ دلائل پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''کشمیریات'' ہمیں صوفیا کی محبت اور امن پر مبنی تعلیمات سے روشناس کراتی ہیں اور ہم سب کو متحد کرتی ہیں۔ اور ایک آزاد جموں و کشمیر میں غیر مسلم اقلیتیں بالکل محفوظ اور سلامت رہیں گی۔ یہ بڑا مضحکہ خیز دعویٰ ہے، ناقدین کی طرف سے یہ ضرور سننے کو ملے گا کہ جب تک سارے کے سارے کشمیری اچانک دنیا چھوڑ دینے کا فیصلہ نہ کر لیں اور راہِ تصوف کے راہی نہ ہو جائیں، ایسا ہوسکنا ممکن نہیں ہے۔ دوسری طرف صوفی ازم کشمیر اور دیگر مقامات پر تیزی سے روبہ زوال دکھائی دے رہا ہے، جیسا کہ تصوف کے دیگر تمام سلسلوں کے ساتھ اس وقت ہو رہا ہے۔

ایک بالکل واضح امر ہے کہ جموں اور کشمیر میں مختلف النوع قومیتوں کو ایک جبری وحدت کے ذریعے ایک جداگانہ خودمختار ریاست میں متشکل کرنا، جیسا کہ قوم پرست چاہتے ہیں، لازماً سول وار کا ایک تیر بہدف نسخہ ہوگا اور بعض کشمیری اسلام پسند بھی جو پہلے پہل پاکستان کے ساتھ الحاق کے سرگرم وکیل ہوا کرتے تھے، اب وہ اٹھنے والی موجوں کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ ان کے اولین موقف کو کوئی پذیرائی حاصل نہیں ہوسکی۔ وہ خود بھی پاکستان سے بددل ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اب وقت آچکا ہے کہ آزادی کے حامی کشمیری سرِ عام اس واضح حقیقت کا اعتراف کریں جس کی یہاں وضاحت

کی کوئی ضرورت نہیں۔

تاہم یہاں ریاست کی تقسیم کی بات نہیں ہو رہی، جیسا کہ دائیں بازو کے ہندو مسلسل پرچار کرتے آرہے ہیں، کیونکہ ایسا کرنے سے فرقہ وارانہ حد بندیاں اور رقابتیں مزید شدت اختیار کر جائیں گی۔ بلکہ اس امر کے اعتراف اور پبلک انداز میں تسلیم کئے جانے کی بات ہو رہی ہے کہ جموں اور کشمیر کا تکثیری کردار ہے اور یہاں آباد سب لوگوں مسلمانوں، ہندوؤں، بودھوں اور دیگر تنظیموں کے خدشات اور احساسات کا خیال رکھا جائے۔

[15/اگست2008ء]

MashalBooks.org

کشمیر میں قیامِ امن: مذہب کے حوالے سے تخلیقی فکر

یہ امر بجا ہے کہ تنازعۂ کشمیر کی سیاسی اور اقتصادی جڑوں کی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور اس کا مذہبی پہلو مرکزی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس سے مسئلے کے سنجیدہ تجزیوں میں بھی اکثر پہلو تہی کر دی جاتی ہے۔ بہر حال یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ مسئلہ اس راہِ عمل کی براہ راست پیداوار ہے جو فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم ہند پر منتج ہوا تھا۔ مزید برآں جیسا کہ معاملے کے بہت سے کلیدی کردار آج اسے دیکھتے ہیں یہ اساسی طور پر ایک مذہبی یا فرقہ وارانہ سوال ہے، اگرچہ اسے یہ تجویز نہیں سمجھا جانا چاہیے کہ تنازعہ کشمیر فطرتاً سیاسی کی بجائے بنیادی طور پر مذہبی ہے۔ یا یہ کہ اس کشمکش کا حل مذہب، اسلام اور ہندوازم دونوں کی ایک لبرل یا ترقی پسندانہ تعبیر میں ہے۔ دونوں مذاہب ایک دوسرے کو برداشت بھی کرتے ہیں اور قبول بھی۔ لہٰذا دونوں کے پیروکار مسئلہ کشمیر کا پُر امن حل تلاش کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

کشمیری صوفی ازم کی روایت جو کشمیر کی تاریخ اور ثقافت میں گہری جڑیں رکھتی ہے، اس میں اسلام کی غیر روا دارانہ اور متعصّبانہ تعبیر کے ساتھ متصادم ہونے کی بے پناہ صلاحیت ہے، اگرچہ اس کی گہرائی اب تک تحقیق طلب ہے، بہرحال اسلام کی غیر روا دارانہ روایات کشمیر میں جاری کشمکش میں ایک کلیدی عامل ہیں۔ کشمیری صوفیوں کے بارے میں اردو، کشمیری اور فارسی زبانوں میں بہت سا لٹریچر موجود ہے۔ حالیہ برسوں میں اس موضوع پر انگلش میں چند کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ایسی متون کا بیشتر حصہ مقدس صحائف کی صورت میں چھپا ہے جو صوفیا کی کرامات اور روحانی کمالات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض

MashalBooks.org

ایسے واقعات ہیں کہ ان میں سے افسانے اور حقیقت کو الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

کشمیری مسلمانوں کی نسبتاً جوان نسل، جسے جدید علوم سے فائدہ پہنچا ہے، اس کے لیے ایسی کتابوں میں کوئی خاص اپیل موجود نہیں ہے۔ اس کا کسی حد تک سبب یہ ہے کہ اس نسل کو اس کا متبادل اسلامی لٹریچر دستیاب ہو گیا ہے جیسے کہ جماعت اسلامی کی مطبوعات ہیں جو کافی تعداد میں پھیلائی گئی ہیں۔ ان مطبوعات میں عوامی تصوف کے مقابلے میں اسلام کی تعلیمات کو بظاہر زیادہ ''قابل فہم'' اور ادبی انداز میں پھیلا دیا گیا ہے۔ کشمیر اور دیگر مقامات پر اسلام کی صوفیانہ شکلوں میں لوگوں کے لیے اپیل کے انحطاط کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ صوفیا کے مزاروں پر قابض بعض مجاور پیرزادے اور سجادہ نشین ٹائپ کے لوگ تصوف کی آڑ میں جو استحصالی حربے استعمال کرتے ہیں لوگوں پر ان کی حقیقت کھل رہی ہے۔ اس عام احساس کے ساتھ یہ بھی مشہور ہو گیا ہے کہ صوفی ازم کا تعلق ''دوسری دنیا'' سے ہے، اس کو لوگوں کے اصل مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کشمیری مسلمانوں کی بہت سی نوعمر نسلیں مزاروں اور خانقاہوں کے ساتھ وابستہ عقائد اور دیگر طور طریقوں کو غیر اسلامی سمجھتی ہیں۔

اس سیاق و سباق میں یہ پوچھنا بالکل بجا ہے کہ کشمیر کی صوفیانہ روایات مذہبی انتہا پسندی اور امتیازات کا مقابلہ کرنے اور دوسرے مذاہب کے عقائد کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر کے تنازعہ کشمیر کے پُر امن حل کے لیے کیا کردار ادا کر سکتی ہیں؟ اگرچہ ایسا ہو سکنے کے امکانات کسی قدر محدود ہیں تاہم یہ یقینی طور پر سوشل ایکشن کی ایک اہم شکل ہے، اسے فروغ دیا جانا چاہیے۔ یہ واضح بات ہے کہ ایسی مساعی سے کرامات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ صوفیانہ سلسلوں سے وابستہ بہت سے کشمیری مسلمان اعتراف کرتے ہیں کہ وہ انڈین آرمی اور عسکری گروپوں کی زیادتیوں کے خلاف زبان کھولنے سے ڈرتے ہیں۔ ان کی جان و مال اکثر خطرے میں رہتے ہیں۔ مسئلہ اس وقت اور بھی گھمبیر ہو جاتا ہے جب صوفیوں کے پیروکار ہونے کا دعویٰ رکھنے والے بہت سے کشمیری بھی عسکری گروپوں کے ہمنوا بن کر ان کے سیاسی مفادات کی حمایت کرنے لگتے ہیں، جن کا نعرہ ''ہندوستان سے آزادی''، ''خودمختاری'' یا ''پاکستان کے ساتھ الحاق'' ہے۔ حالانکہ ان صوفیانہ مزاج رکھنے والوں کا ان کے مخصوص عقائد اسلام یا دیگر طور طریقوں سے اتفاق ضروری نہیں ہوتا۔

MashalBooks.org

تاہم ان عوامل کے پیش نظر جو تنازعہ کے پُر امن حل میں کشمیری صوفیانہ روایت کے ممکنہ کردار کو محدود کرتے ہیں، سول سوسائٹی اس سلسلے میں غالباً قابل قدر مدد کر سکتی ہے۔ اس کا ایک طریقہ صوفی ازم اور بالخصوص کشمیری صوفیوں سے متعلق اردو اور انگلش میں نئے ادب کو فروغ دینا ہے جو بزرگوں کے سماجی کردار اور ان کی اخلاقی تعلیمات پر مرکوز ہو، نہ کہ سارا زور قلم ان سے منسوب کرامات کے قصے کہانیاں بیان کرنے پر صرف کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ان خاص صوفیا کے کردار کو زیادہ نمایاں کیا جانا چاہیے جنہوں نے اسلام کی وسیع تعلیمات کی تفہیم کی بنیاد پر سماجی عدل اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دیا تھا۔ ایسے متون ضخیم کتابوں کی بجائے کتابچوں کی شکل میں ہونے چاہئیں۔ اور ان کی قیمتیں بھی زیادہ نہیں ہونی چاہیے تا کہ یہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچ سکیں۔ نئی شکل کی صوفیانہ تحریروں کے علاوہ کشمیری تصوف پر سمینار منعقد کئے جائیں اور کشمیر اور جموں کی یونیورسٹیوں، علاقائی کالجوں اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی اسے شامل کیا جائے، جہاں کشمیری مسلمانوں کے ثقافتی اور مذہبی ورثے کے بارے میں بہت لاعلمی پائی جاتی ہے۔

مسئلے کے پُر امن حل کی تلاش میں انڈین مسلم سول سوسائٹی گروپ بھی بہت فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اگر ایسے گروپ کشمیر میں فعال نہیں رہے تو اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ خطے میں اپنے ہم مذہبوں کے مسائل کے بارے میں بے حس ہیں بلکہ اس خوف سے ان کے حق میں آواز بلند کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ انہیں قوم دشمن قرار دے دیا جائے گا۔ یہ ایک المیہ ہے، نہ صرف اس لیے کہ ان کے بھی وہی حقوق و فرائض ہیں جو دوسروں کے ہیں کہ وہ کشمیر میں قیام امن میں مدد دیں بلکہ وہ اس لحاظ سے منفرد حیثیت بھی رکھتے ہیں کہ وہ ایسا کریں۔ بہت سے انڈین مسلم تنازعۂ کشمیر کے پُر امن حل کو اپنی بقا اور اپنی ترقی کے لیے ایک بنیادی ضرورت سمجھتے ہیں کیونکہ خطے میں مسلسل جاری چپقلش انڈیا کے متعصب ہندوؤں کو مسلم دشمن تحریکیں چلانے میں مزید مدد دیتی ہے۔ اس طرح کشمیر کے امن میں انڈین مسلمانوں کی زیادہ بھلائی ہے۔ انڈین مسلم تنظیموں اور علما کا کشمیری مسلمانوں کے بہت بڑے حصے کی رائے پر گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ کشمیر کی بُک شاپس پر دستیاب تقریباً سارا لٹریچر انڈیا بالخصوص دہلی میں مقیم اسلامی گروپوں کا شائع کردہ ہے۔ حالیہ برسوں میں کشمیر

میں کھلنے والے متعدد مدرسوں میں سے بیشتر کا تعلق خود انڈیا کے بڑے مدرسوں سے ہے، یہ مدرسے دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث مکاتب فکر کے ہیں۔ ان مدرسوں کے بعض اساتذہ شمالی ہند (زیادہ تر بہار اور مشرقی اتر پردیش) سے آئے ہوئے ہیں۔ ان مدارس کے جید علما نے انڈیا کے بڑے بڑے مدارس سے اسنادِ فراغت حاصل کر رکھی ہیں اور اب تک ان سے منسلک چلے آ رہے ہیں۔

اس صورت احوال میں بھارتی مسلم تنظیموں اور علما کے آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے کہ وہ کشمیر میں امن کے فروغ میں فعّال کردار ادا کریں۔ چونکہ انہیں کشمیری مسلمانوں کے ممتاز طبقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس لئے وہ اپنے اثر و رسوخ کو بروئے کار لا کر اس حوالے سے مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ متعدد انڈین مسلم گروپ اور افراد انڈیا میں مکالمہ بین المذاہب اور فرقہ وارانہ یکجہتی کے لیے کام کرتے آ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں عملی کام کے ساتھ ساتھ اپنے عقیدے کے اہل علم اور ہم خیال لوگوں کے تعاون سے اس موضوع پر لٹریچر بھی شائع کر رہے ہیں۔ انہیں کشمیر میں بھی اپنی سرگرمیاں بڑھانے کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ اگر وہ اپنے اصرار پر ثابت قدم ہیں کہ اسلام منصفانہ امن اور فرقہ وارانہ تعلقات کا خواہاں ہے تو یہ بات صرف مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کے سیاق و سباق ہی میں نہیں رہنی چاہیئے جیسے کہ بھارت میں بحیثیتِ مجموعی ہے بلکہ وہاں بھی ہونی چاہیے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں جیسے کہ کشمیر میں۔

اگر بھارت میں فعالیت پسند مسلمان جو مختلف مذاہب میں مکالمے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دے رہے ہیں، وہ باقاعدگی سے کشمیر بھی آیا جایا کریں اور مقامی مسلمانوں اور دیگر سماجی فعالیت پسندوں کے درمیان رابطوں کو فروغ دیں تو اس سے صورت حال بہت بہتر ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں بھارت میں تین اسلامی گروپ جماعتِ اسلامی ہند، مرکزی اہلِ حدیثِ ہند اور دارالعلوم دیوبند خاص طور پر فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس صورت میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کا فہم اسلام تین گروپوں (جماعت اسلامی پاکستان، لشکر طیبہ [اہل حدیث پاکستان کے ساتھ ان کے روابط] اور جیش محمد [پاکستان دیوبندیوں کی ایک شاخ کے ساتھ ان کے روابط کے]) کے ساتھ مشترک ہے جو

آج کشمیر کے اندر کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ انڈین جماعت اسلامی اور اسی طرح متعدد انڈین اہل حدیث اور دیوبندی علمانے مجموعی طور پر پاکستان میں موجود اپنی ان جماعتوں سے مذہبی انتہا پسندی کے مسئلے پر قدرے مختلف موقف اختیار کر رکھا ہے جو بین المذاہب ہم آہنگی اور تنازعۂ کشمیر کے پُرامن حل پر زور دیتی ہیں۔ انہیں کشمیر میں زیادہ فعال کردار ادا کرنے کی ترغیب دینا کوئی مشکل بات نہیں ہوگی کیونکہ کشمیری مسلمانوں میں ان کا کافی اثر و رسوخ ہے، ان کی مداخلت بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ مگر اس کے لئے بھارتی ریاست کو ان کا اعتماد حاصل کرنا ہوگا، جو صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب یہ سمجھا جائے کہ وہ واقعی خلوص کے ساتھ خود بھارت کے اندر بین المذاہب اعتماد کی فضا پیدا کر رہی ہیں اور انڈین مسلمانوں کو جو بہت سی شکایات ہیں وہ بھی دور کی جائیں۔

اسلام کے اس فہم اور ان واضح تصورات کو فروغ دیا جائے جو دوسرے لوگوں کے مذاہب کو مفاہمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اختلافات کو رفع کرنے کے لیے پُرامن ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مقصد کے لیے ہندو ازم کو بھی (مع انڈین نیشنل ازم کے) زیادہ مفاہمت کے انداز میں دیکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اسلام پسندی اور ہندوتوا، دونوں ایک دوسرے کی پرورش کرتی ہیں، دونوں کے خلاف مل کر لڑنا ہوگا۔

[20/جولائی 2006]

MashalBooks.org

کشمیری صوفی ازم: قیام امن کے مذہبی ذرائع

کشمیر میں جاری ہل چل بنیادی طور پر ایک مذہبی کشمکش ہے جسے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک متشدد اور خطرناک تصادم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے کلیدی کھلاڑی انتہا پسند مسلمان اور متعصب ہندو ہیں۔ یہ ایک مذہبی جنگ ہے جو بعض لوگوں کے نزدیک خیر وشر کی قوتوں کے مابین ازل سے برپا عظیم کائناتی معرکوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

اس مفہوم میں تنازعۂ کشمیر، ان فرقہ وارانہ مناقشوں کی طرح ہے جو باقی ماندہ جنوبی ایشیا میں جگہ جگہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی نوع کے اجزا پر مشتمل معاشرے ہیں مگر واضح طور پر الگ الگ تشخص رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان چپقلش صدیوں پہلے، ایک دوسرے کا سامنا کرتے ہی بڑے شدت سے برپا ہوگئی تھی۔ اس طرح کشمیر میں برپا کشمکش، ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ سے مسلسل جاری آویزشوں کی تاریخ کا تازہ ترین سٹیج ہے جس میں ہندو اور مسلمان آمنے سامنے ہیں، ان کے مذہبی عقائد ایک دعوے کے مطابق ایک دوسرے سے اتنے مختلف اور اتنے متناقض ہیں کہ ان کے درمیان کشمکش مسلسل جاری رہنا ناگزیر ہے۔ تنازعۂ کشمیر کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بہت سے مشترک حقائق اور اقدار کی موجودگی، کثیر العناصر، مخلوط الاصل، متراکب شناختوں اور اشتراک و تعاون کی طویل تاریخ، سب کی تکذیب ہو جاتی ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو جدا جدا، برسرِ پیکار اور ایک ہی پتھر سے تراشے ہوئے دو بلاکوں کی حیثیت رکھنے کا تصور (جیسا کہ مؤرخین کو اب تیزی سے احساس ہو رہا ہے) بالکل ایک جدید حاصلِ ادراک (modern construct) ہے۔ برطانوی عہد سے قبل

کے ہندوستان میں معاشرتی تشخصات اکثر دھندلے اور مبہم ہوا کرتے تھے جن میں گروپوں اور افراد کے درمیان کافی جزوی انطباق(overlaps) عبوری مقامات(cross overs)اور مشترکات(sharings) تھیں، ممکن ہے کہ وہ افراد یا گروپ اپنے ''ہندو'' یا ''مسلمان'' ہونے کا شعور نہیں رکھتے تھے۔ اور ایسے کیسوں میں بھی جن میں مذہبی اور فرقہ وارانہ شناختیں بالکل واضح تھیں، بہت سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترک دنیا ہوا کرتی تھی، ان کے بعض عقائد اور اقدار بھی یکساں تھیں اور وہ ایک دوسرے کے بزرگوں سے بھی یکساں طور پر اظہار عقیدت کرتے تھے۔

کشمیر بعض مشترکہ مذہبی تشخصات کی واضح ترین مثالوں کا مرقع ہے جو آج بھی وہاں پائی جاتی ہیں گو کہ وہ کم نمایاں ہیں۔ جیسا کہ متعدد مصنفین نے نوٹ کیا ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں اور پنڈتوں کی کئی روایات اور عقائد یکساں تھے۔ وادیٔ کشمیر میں جا بجا صوفیوں کے ایسے مزارات پائے جاتے ہیں جہاں ہندو اور مسلمان کثیر تعداد میں جا کر اپنے اپنے رنگ میں اظہار عقیدت کرتے تھے۔ بلاشبہ کشمیری ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذاہب، ذاتوں اور فرقہ وارانہ اختلافات کا شعور رکھتے تھے تصوف لوگوں میں دنیا اور اس کے امور کے بارے میں مشترکہ سوچ پیدا کر رہا تھا وہ عظیم صوفیا کی روحانی قوتوں پر ایمان رکھتے ہوئے بڑی تعداد میں مزاروں پر حاضری دیتے تھے وہاں ان کا اکٹھ روزمرہ کی زندگی میں کشمیری مسلمانوں اور پنڈتوں کے درمیان ایک مکالمے کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ وادی کے جنوب میں صوبہ جموں میں جو کہ پنجاب سے متصل ہے صوفیا کے عقیدتمندوں کی بہت بڑی تعداد تھی جن میں ہندو، دلت، مسلمان اور سکھ سب شامل تھے۔ اگرچہ یہ مشترکہ روایتِ عامہ اتنی زیادہ طاقتور نہیں تھی کہ وہ مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات مکمل طور پر مٹا دیتی تاہم وہ اتنا کام ضرور دیتی تھی کہ معاشرتی سرحدوں کے آر پار لوگوں میں باہمی تعلقات کو استحکام بخشتی رہے۔

جموں اور کشمیر کی صوفیانہ روایات اب بھی خطے کے بہت سے لوگوں کی زندگیوں میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان روایات اور چند دیگر مذہبی ذرائع کو جو قرآن مجید سے ماخوذ ہیں اور کچھ وہ جو ہندو ازم سے لی گئی ہیں، انہیں فروغ دے کر خطے میں پائے جانے والے

دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جا سکتا ہے۔ آج ان سب مذاہب کے ماننے والوں اور سماجی طور پر متحرک لوگوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مل جل کر مکالمہ بین المذاہب کو فروغ دیں، تاکہ مذہبی منافرتیں کم ہوں۔ یہ منافرتیں جو تیزی سے پھیل رہی ہیں جموں و کشمیر کے لوگوں کی زندگیوں کو تباہ کر رہی ہیں اور موت اور تباہی کا ایک نہ رکنے والا چل رہا ہے۔ کشمیری اپنی سرزمین کو ''پیروائر'' یا ''رشی وائر'' یعنی رشیوں اور صوفی پیروں کا خطہ کہتے ہیں جہاں تقریباً ہر گاؤں میں اولیا (خدا کے دوستوں) کے ناموں سے منسوب مزار پائے جاتے ہیں۔ ان صوفیا کا تعلق تصوف کے مختلف سلسلوں سے تھا۔ کشمیر میں ایک قدیم مزار جس کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ یہ ترکستان سے آئے ہوئے سید شرف الدین عبدالرحمان کا ہے جسے لوگ اشتیاق کے ساتھ بُلبل شاہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ 1295 میں کشمیر پہنچے تھے اور انہوں نے بودھ مذہب کے حکمرانِ کشمیر رنچن شاہ سمیت نچلی ذات کے ان ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا تھا جو برہمنوں کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے۔

دوسرے صوفی بزرگ جو چودھویں صدی میں کشمیر میں داخل ہوئے ایرانی کبراوی میر سید علی ہمدانی تھے۔ انہوں نے متعدد افراد کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا جس میں ان کی متاثر کن شخصیت اور طرز بیان کا بھی دخل تھا۔ انہیں عرفِ عام میں ''امیر کبیر'' اور ''بانیٔ مسلمانی'' [در کشمیر] کہا جاتا ہے۔ ان کے ہمراہ ان کے متعدد ایرانی مرید بھی آئے تھے جو کشمیر کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئے اور اسلام پھیلاتے رہے۔ ان کے سلسلے کو ''کبراوی سلسلۂ تصوف'' کہا جاتا ہے۔

صوفیا کے ذریعے اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ایک طاقتور معاشرتی تحریک بن گئی۔ ہندوؤں کی نچلی جاتی اور بودھ مت کے پیروکار ہزاروں کی تعداد میں ذات پات کے نظام اور برہمنیت سے نجات کے لیے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ عہد متوسط کے کشمیر میں اسلام اور مقامی روایات کے مابین تصادم کا نتیجہ ''مسلم رشی'' تحریک کی صورت میں نکلا۔ جو کہ کشمیر میں واحد دیسی سلسلۂ تصوف تھا۔ رشی ازم ترقی کرتے کرتے ان دنیادار علما کے خلاف ایک زبردست چیلنج بن گیا جو بادشاہوں کے درباروں اور برہمنی نظام کا حصہ تھے۔ رشی تحریک کی جڑیں وسیع تر اسلامی روایت میں پیوست تھیں یہ مذہب سے بالاتر ہو کر ساری

مخلوقِ خدا کے ساتھ امن و ہم آہنگی، محبت اور بھائی چارے کا درس دیتی تھی۔ اس لئے لوگوں میں اس کے لیے بہت کشش تھی۔ رشی تحریک کے متوسلین کی مساعی کی بدولت لوگ وسیع پیمانے پر اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ ان صوفیوں کا احترام وہ لوگ بھی کرتے تھے جو اپنے آبائی مذاہب سے گہری پیوستگی کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کر سکے تھے۔ رشیوں کے مزار، جو جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے کشمیری مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ مرجع عام و خاص تھے۔ اس طرح یہ مزار مختلف مذاہب، ذاتوں اور عقیدوں کے مابین مراسمِ محبت و یگانگت بڑھانے کا طاقتور ذریعہ تھے۔

رشی تحریک کے مآخذ زمانہ قبل از اسلام میں ملتے ہیں۔ ویدوں کے دور میں رشی، مشہور زمانہ تارکین دنیا، راہب ہوا کرتے تھے جو جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں میں بیٹھ کر سخت ریاضتیں کرتے اور اپنے جسموں کو تکلیفوں میں ڈال کر اپنی روحانی طاقت میں اضافہ کرتے تھے۔ بعد ازاں بودھوں کے زمانے میں رشیوں نے بھکشوؤں کی شکل اختیار کر لی اور اپنی ساری زندگی غریبوں اور محتاجوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ کشمیر میں مسلم رشی کی تحریک کے بانی نورالدین نورانی (1377-1440) تھے جنھوں نے پہلے سے موجود رشی تحریک کو تبلیغ اسلام کا ذریعہ بنایا، انہوں نے مقامی اداروں اور مروجہ طریقوں کو استعمال کر کے اسلام کو زیادہ قابل فہم بنایا۔

نورالدین نورانی، نندرشی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے ہندو پنڈت پیروکار انہیں ''سہاز انند'' (سکوں و رحمت) کہتے۔ نورالدین نورانی کا پیغام اسلام کا عالمگیر پیغام تھا جو محبت، رواداری اور خدمت کی تلقین کرتا ہے اور بے انصافی اور عدم انصاف کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ نورالدین کی بصیرت کی وسعت کا اس حقیقت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک خاتون صوفیہ کی شاگردی اختیار کی۔ جن کا نام ''لالیشواری'' تھا، انہیں مسلمان عقیدت سے ''لالہ ماج'' (ماں لالہ) یا لالہ عارفہ کہتے تھے۔ اگرچہ لال دید ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئی اس نے توہمات اور برہمنی مذہب کی بے روح رسموں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ وہ برہمن پروہتوں کے لیے تلخ جملے استعمال کرتی اور کہتی کہ تم نے مذہب کو بے جان اور بے روح رسموں کا مجموعہ بنا رکھا ہے جن کا سماج کی اصلاح کے ساتھ کوئی تعلق

نہیں۔

''احمقو! بھوکے رہنے اور اس قسم کی دوسری رسموں میں کوئی نیکی نہیں ہے۔ بُت محض ایک پتھر ہے اسی طرح مندر بھی اوپر سے لے کر نیچے تک محض ایک پتھر ہے۔''

لال دید ہندوؤں اور مسلمانوں سے کہتی کہ وہ اپنی مشترک انسانیت پر نظر ڈالیں، سارے انسان اسی ایک خدا کی مخلوق ہیں چنانچہ اس نے اپنے اشعار کی زبان میں کہا:

شیو شنکر ہر جگہ موجود ہے۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان میں امتیاز نہ کرو، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ پھر اپنے اوپر غور کرو، سچی بات یہ ہے کہ یہ خدا تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

لال دید بے ہئیت ''خدا'' کی عبادت کے جذبے سے سرشار تھی جسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں نندرشی کہتا ہے:

پدمن پور کی وہ لالہ
جس نے سوم رس جی بھر کے پیا تھا
وہ ہماری اوتار تھی
اے خدا مجھے اسی کی روحانی قوت دے

ایک اور شعر میں نندرشی لال دید کا نام لے کر خدا سے کہتا ہے:

لالہ نے چشمۂ دوام سے پیٹ بھر کر پانی پیا
اس نے شیو کی بے پناہ قدرت کا مشاہدہ کیا
اس لیے ہمارے دل اس کی بے پناہ تعریف کا خزانہ بنے ہوئے ہیں
اس نے اپنے لیے بہت بلند رتبہ کمایا ہوا ہے
اے خدا مجھے بھی یہی نعمت عطا کر

اگرچہ (یا شاید) وہ ایک متقی مسلمان تھا، اس کا فہم اسلام اتنا وسیع تھا کہ اس میں دیگر مذاہب والوں کے لیے بھی گنجائش تھی۔ اس طرح اس کے بارے میں یہ کہانی سنائی جاتی

MashalBooks.org

ہے کہ وہ ایک ہندو کسان لڑکی بھاون سے بہت متاثر ہوا جو گاؤں میں پانی ڈھوتی اور اپنی ساری کمائی اپنے پرندوں کو پانی پلانے اور چوگ ڈالنے پر خرچ کر دیتی جبکہ خود بھوکی رہتی تھی۔ چنانچہ نندرشی نے خدا سے یہ دعا مانگی:

چھوٹے گاؤں کی وہ چھوٹی لڑکی جس نے پیاسوں کی پیاس بجھائی
اپنے پالے ہوئے پرندوں سمیت اڑ کر بلند آسمانوں میں جا پہنچی
یا خدا مجھ پر بھی ایسا ہی کرم کر دے

یہ احساس کہ ہندو اور مسلمان اسی ایک خدا کی اولاد ہیں جسے وہ مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں، ہم آہنگی اور مصالحت کا ایک طاقتور پیغام ہے۔ اس طرح نندرشی نے پُر درد انداز میں کہا:

جب ہندو اور مسلم دوئی کے درخت کو کاٹ دیں گے
جب خدا خوش ہو جائے گا اور ہم پر اپنی عنایت عطا کرے گا
ہم انہی والدین سے تعلق رکھتے ہیں
تو یہ اختلاف کیسا ہے؟
ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکیلے اکیلے عبادت کرنے دو
ہم اس دنیا میں پارٹنر بن کر آئے ہیں
ہمیں ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک رہنا چاہیے

مسلم رشی روایت کا سنگ بنیاد ہی دوسروں کی مدد کرنا تھا۔ عبادتِ خدا اس وقت تک بے معنی سمجھی جاتی ہے جب تک اس کا اظہار ضرورتمندوں کی مدد کی صورت میں نہ ہوتا ہو۔ خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ اس نے اپنے بڑے بڑے شاگردوں میں سے ایک بابا نصرو سے کہا: ''او نصیر الدین دنیا کو وہی جیتے گا جو دوسروں کی خدمت کرتا ہے۔ ایک اور مقام پر اس نے کہا:

اے ہندوو اور مسلمانوں، تم کیسے نجات پاؤ گے
اگر تم اپنے ساتھ نیکیوں کا توشہ نہیں لے جاؤ گے

MashalBooks.org

نمازیں اور عبادتیں، اگر اپنے ساتھ اچھے کام نہ لے گئیں
نہ صرف خدا خوش نہ ہوگا
ساتھ انہیں دوزخ بھی جانا ہوگا

نند رشی کے بہت سے اشعار میں خالی خولی عبادتوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ سماجی انصاف اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک انسانیت سے اپیل کرتے ہوئے کہتا ہے:

مسجد میں ملاّ اور پتھر کے بُت کے سامنے برہمن
ان ہزاروں میں سے شاید ایک آدھ بخشش پائے گا
ورنہ سب شیطان کے پنجے میں پھنس جائیں گے

☆

جعلی درویش تسبیح کے دانے رولتا ہے
صرف ان کی آواز سے خوشی بٹورتا ہے
لیکن مسجد کا دروازہ بند کرتا ہے اپنی عبادت نہیں کرتا
یاد رکھ اوئے دھوکے باز
تو خدا کا دوست نہیں، اس کا دشمن ہے۔

جعلی رشی ہمیشہ پیٹ کی فکر کرتا ہے
لذیذ غذائیں کھا کر اس نے خدا کو بھلایا ہے
رشی کا لباس پہن کر یہ دوسروں کو گمراہ کرتا ہے
اگر یہ رشی ہے تو پھر چور کون ہے؟

☆

ملاّ تحفوں اور دعوتوں پر خوش ہے
شیخ حرص اور طمع کا مارا ہوا ہے
صوفی دوسروں کو دھوکا دیئے بِنا نہیں رہتا
تین سیر بکرے کا گوشت ایک من چاول

MashalBooks.org

پتلا کمزور پنڈت کنواری بیوی کا ہے متلاشی
چتا تک پہنچ کر بھی وہ بیوہ کو بیوی بنانے سے ہے انکاری

☆

اے بندۂ خدا تمہارے ہاتھ میں ایک تسبیح ہے
لیکن ایسا نہیں، یہ اصل میں ایک چاقو ہے
تو نے کھولی ہے دکان اس فانی دنیا کے بازار میں
لوٹنے کے لیے دوسروں کو لگا کر گھات
ذرا غور کرو، کہیں تم آگ کا ایندھن نہ جانا
بات بڑے افسوس کی ہے
تو نے اپنی کلہاڑی سے پاؤں اپنا کاٹا ہے

☆

اس نندرشی کی وفات کے بعد اس کے متعدد نائبین کی زیر قیادت کشمیر میں رشی تحریک مزید پھیل گئی۔ اپنے آقا کی طرح انہوں نے بھی خطے میں اسلام کے پُر امن پھیلاؤ کے لیے مرکزی کردار ادا کیا۔ وہ سماجی ناانصافیوں، عدم مساوات اور توہمات، درباری علما کی ظاہر داریوں اور برہمن پروہتوں کے ظلم وستم پر بدستور کڑی نکتہ چینی کرتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور ہم آہنگی کا پیغام بھی پھیلاتے رہے۔ مسلمان اور ہندو آج دن تک نند رشی کو اپنا قومی بزرگ اور اپنے ملک کی روحانی اور ثقافتی علامت سمجھتے ہیں اور اسے ''شیخ العالم'' کے طور پر یاد رکھے ہوئے ہیں۔

جیسا کہ وادیٔ کشمیر میں ہوا، جموں میں بھی مختلف صوفیاء نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پُل تعمیر کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ساتھ ساتھ وہ خطے میں اسلام پھیلانے کی بھی سرگرم کوششیں کرتے رہے۔ آج صوفیوں کی بیسیوں خانقاہیں پورے جموں میں موجود ہیں جن میں ہندو سکھ مسلمان اور دلت اکٹھے ہوتے ہیں۔ بہت سے مزاروں اور خانقاہوں میں غیر مسلموں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ ان صوفیا کے بارے میں سنائی جانے والی کہانیوں میں خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جموں میں تصوف کو مقبول

MashalBooks.org

بنانے اور بین المذاہب ہم آہنگی کا ذریعہ بنانے میں ہندو مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔

دستیاب ذرائع کے مطابق جموں میں سب سے پہلے جس صوفی کی آمد ہوئی وہ ''گلاب نامے'' کے مطابق حضرت محمدؐ کے ایک ہمعصر پیر روشن علی شاہ تھے۔ ''گلاب نامہ'' انیسویں صدی کی تاریخِ جموں ہے۔ اس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ پیر روشن علی ساتویں صدی عیسوی میں جموں آئے تھے۔ تاہم یہ دعویٰ نا قابل اعتبار نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کا ہندو حکمران راجہ سرپالا دھر (بادشاہ) ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ان سے یہیں آباد ہونے کی درخواست کی، چنانچہ وہ یہیں بس گئے اور یہیں دفن ہوئے۔ ایک اور صوفی بزرگ جن کا مزار جموں میں ہے پیر ''لکھ داتا'' تھے۔ غریبوں سے ان کے فیاضانہ برتاؤ کی وجہ سے ان کے ہم عصر اور دوست گورونانک نے انہیں ''سلطان لکھ داتا'' کا خطاب دیا تھا۔ انہی کی طرح بابا بدھن علی شاہ تھے جن کی درگاہ جموں میں ایرپورٹ کے قریب ہے۔ ہندو، دلت، سکھ اور مسلمان سب ان کی یکساں عزت کرتے تھے۔ یہ حضرت محمدؐ کی نسل میں سے تھے اور ان کا اصل نام سید شمس الدین تھا اور وہ بھی گورونانک کے دوست تھے۔ پندرھویں صدی کے ایرانی اسماعیلی شیعہ بزرگ ''پیر مٹھا'' تھے ان کا مزار دریائے توی کے کنارے ایک گاؤں میں ہے، جس کا نام انہی کے نام پر پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کی ایک ذات ''جھیر'' کے سرپرست پیر تھے۔ ان کی ''گورکھ ناتھی'' یوگی غریب ناتھ کے ساتھ دوستی تھی اور وہ دونوں ایک غار بنام ''پیر کھوہ'' میں اکٹھے رہے تھے۔ یہ جموں شہر سے باہر ہے جو اب ایک بڑا گورکھ ناتھی مرکز ہے۔ انیسویں صدی کے ایک صوفی بابا جیون شاہ تھے، ان کا مزار بھی جموں میں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے کئی مرید ہندو تھے جن میں مہاراجہ رنبیر سنگھ، کشمیر کا ڈوگرہ حکمران تھا۔ ایک اور صوفی جن کی کہانی ڈوگرہ حکمرانوں سے منسلک ہے سید غلام علی بادشاہ تھے ان کا مزار ضلع راجوڑی میں تھانہ منڈی کے قریب ہے اور ریاست کی سب سے بڑی ''درگاہ'' ہے۔

اس طرح جموں و کشمیر کی صوفیانہ روایات نے مختلف ذاتوں اور عقیدوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بہت سے صوفیا کے مرید ہندو تھے۔ چنانچہ متعدد مزاروں اور درگاہوں کی یاترا کے لیے آنے والوں میں ہندوؤں کی تعداد

MashalBooks.org

مسلمانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں سے اگر سب نہیں تو بیشتر ہندو ضرور ان صوفیا کی تعلیمات سے آگاہ ہیں۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کا یہاں اکٹھ ہوتا ہے اس سے مذہب کے تصورات اور مذہبی شناختوں کے حوالے سے بین المذاہب تعلقات میں انقلابی تبدیلیاں آسکتی ہیں۔

جموں اور کشمیر کی مقبول عام صوفیانہ روایات میں اس امر کی کافی صلاحیت موجود ہے کہ انہیں مذہب کے جامع نئے تصورات ابھارنے کے لیے استعمال کیا جا سکے اور ایسی عالمگیر محبت پیدا کی جائے جو تنگدلی سے وضع کی گئی فرقہ وارانہ حد بندیوں سے بالا ہو کر فروغ پائے۔

[21/جولائی2006]

MashalBooks.org

کشمیر میں شریعت پر مبنی اسلام اور مکالمے کے امکانات

انڈین میڈیا مذاکرات میں کشمیر مسلمانوں کو اکثر گھسی پٹی اصطلاحوں میں پیش کیا جاتا ہے، یعنی انہیں ایسے لوگوں کے طور پر سامنے لایا جاتا ہے جو اسلام کی ایک ایسی بے لچک تعبیر پر مصر ہیں جس کے مطابق وہ دوسرے مذاہب اور ان کے ماننے والوں سے پُرامن بقائے باہمی کے اصولوں کے ساتھ زندہ رہنے کے دلی طور پر مخالف ہیں۔ بعض اوقات میڈیا کشمیر میں اسلام کی دوسری اقسام پر ہوتے ہوئے عمل کا ذکر ضرور کرتا ہے مگر بہت کم۔ خاص طور پر گہری جڑیں رکھنے والی صوفیانہ روایات کا میڈیا میں کبھی کبھار ہی ذکر ہوتا ہے۔ تاہم کشمیری مسلمانوں کے مذہبی سیاق وسباق میں میڈیا انہیں مجموعی طور پر لازماً ڈرامائی سنسنی خیز اور متشدد انداز میں پیش کرتا ہے۔ مثلاً یہ کہ انتہا پسند مسلمان معصوم لوگوں کو کسی معقول وجہ کے بغیر قتل کر دیتے ہیں، عورتوں سے جبراً پردہ کرایا جاتا ہے، خواہ وہ مرد بھی رہی ہوں انہیں برقعہ ضرور پہننا چاہیے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ الیکشنز میں عورتوں کا ووٹ دینے کا حق غیر اسلامی ہے۔ اس طرح میڈیا چھوٹے چھوٹے سخت گیر اسلامی گروہوں کو کشمیری مسلمانوں کے ترجمان کے طور پر پیش کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں یہاں اکثریت حاصل ہے جبکہ ان کی قوت محض لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کی بنیاد پر قائم ہے اور تمام کشمیریوں کو جبراً ان کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

MashalBooks.org

عہد حاضر کے کشمیر میں اسلام کی یہ تصویر واضح طور پر مسخ کردہ، محدود اور مطلب پرستانہ ہے جسے جان بوجھ کر سنسنی خیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک تو درست ہے کہ سخت گیر اسلام پسند عناصر کشمیر میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کے عہد متوسط کے طرز حکمرانی اور اس دور کی مسلم فقہ کے نفاذ کے لیے حمایت بہت محدود ہے۔ ایسے انتہا پسندوں کی کھلم کھلی مخالفت یا پُر زور مزاحمت کی کمی سے یہ مطلب نہیں لیا جانا چاہیے کہ ان کی مخصوص اسلامی چھاپ پر مبنی ریاستی ایجنڈے کے لیے وسیع پیمانے پر حمایت پائی جاتی ہے۔ نجی گفتگوؤں میں بہت سے کشمیری ان کے سخت گیر اسلام کی مخالفت کرتے ہیں لیکن قتل ہونے یا تشدد کا نشانہ بننے کے خوف سے اپنی آرا کا برملا اظہار نہیں کرتے۔ بیشتر کشمیری رہنما ایسے انتہا پسندوں کی حمایت سے گریزاں ہیں۔ جتنے کچھ ان کی حمایت کرتے ہیں وہ صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ انڈین آرمی کو عسکری انداز میں مصروف رکھ سکتے ہیں لیکن وہ ان کے اس من پسند سیاسی نظام سے، جسے یہ بالآخر نافذ کرنا چاہتے ہیں، اتفاق نہیں کرتے۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ کشمیر میں ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی طرز کے عمومی بیانات (sweeping generalizations) جاری کرنے کا رویہ تبدیل کیا جائے اور اس تنوّع پر زور دیا جائے جو اسلام کی تعبیر اور عمل کی خصوصیت ہے۔

کشمیر میں اسلام کے بارے میں علمی حلقوں اور میڈیا میں ہونے والی بحثوں میں بعض اوقات توجہ ''شریعت پر مبنی (scripturalist) اسلام'' اور ''صوفیانہ اسلام'' کے فرق پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اول الذکر اسلام کو مخصوص "monlithic" اصطلاحات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جو دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ پُر امن بقائے باہمی کے اصول کے تحت زندگی گزارنے کا مخالف ہے۔ مؤخرالذکر کو حقیقی اسلام کے طور پر پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اسلام اور ہندوازم کا ملغوبہ کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ہندوؤں کے لیے زیادہ قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔ ان کے مابین یہ فرق کسی کسی سیاق و سباق میں ممکن ہے کہ مفید ہو لیکن صرف محدود مفہوم میں فائدہ مند ہے۔ جبکہ صوفیانہ روایتِ اسلام نے تاریخی طور پر ایک ثقافتی دنیا کو معرض وجود میں لانے میں بڑی مدد کی ہے جس میں مسلمان اور پنڈت مِل جُل کر ایک اجتماعی زندگی گزار سکتے ہیں۔ جہاں تک شریعت پر مبنی اسلام کا تعلق ہے اگر تعریف کی رُو

سے دیکھا جائے تو یہ کلّی طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے پُرامن بقائے باہمی کا مخالف نہیں ہے۔

شریعت پر مبنی اقسامِ اسلام بجا طور پر اور کئی ایک وجوہ کی بنا پر پچھلے کئی عشروں سے کشمیر میں مزید نمایاں ہو گیا ہے، تاہم یہ اقسام دین مقبولِ عام اور گہری جڑوں والے صوفیانہ عقائد کی بیخ کنی نہیں کر سکیں۔ یہ سچ ہے کہ اسلام کی بعض سخت گیر قسمیں ''مستند مذہبی تکثیریت'' (genuine religious pluralism) کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتیں لیکن یہ اس امر کا استحقاق نہیں رکھتیں کہ ان کی تعمیم کر کے انہیں پورے اسلام کی نمائندہ سمجھا جائے۔ اس کے متعدد منفرد طریقے ہیں جنہیں بروئے کار لا کر اس وسیع روایت کی تعریف متعین کی جا سکتی ہے، تعبیر کی جا سکتی ہے اور زیرِ مشق لایا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض دیگر مذاہب کے لوگوں کو زیادہ قبول کر سکتی ہیں جبکہ ان کا اسلام کو واحد ذریعۂ نجات سمجھنے کا عقیدہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔ تنازعۂ کشمیر کے پُرامن حل کی تلاش اور اس کے مکالمے کو آگے بڑھانے کے لیے لازم آتا ہے کہ مقبول عام صوفی ازم کے حامیوں اور شریعت پر مبنی اسلام کے حامیوں کے مابین فرق کو تسلیم کیا جائے لیکن اس کے علاوہ مؤخرالذکر روایت کے اندر بھی کئی خیالات پائے جاتے ہیں، ان میں سے بعض کے علمبردار مکالمے کے لیے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ میلان رکھتے ہیں، انہیں بھی لازماً پیشِ نظر رکھا جانا چاہیے۔

آج کشمیر میں شریعت پر مبنی اسلام کی وہ قسم جس کی دیگر مذاہب کی طرف سے واضح مخالفت پائی جاتی ہے وہ پاکستان میں قائم لشکرِ طیبہ ہے جو نظریاتی طور پر پاکستانی اہل حدیث سے منسلک ہے اور وہ سعودی وہابیوں کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ لشکر طیبہ کے لٹریچر میں دیگر مذاہب کے بارے میں منفی حوالہ جات کی بھرمار ہے۔ خاص طور پر ہندوازم کی شدید مخالفت پائی جاتی ہے۔ یہ اسلام اور ہندوازم کو ایک دوسرے سے قطبین کی طرح دُور قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف مسلسل جہاد کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ وہ انہیں دشمنانِ اسلام سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے خلاف عالمی سطح پر جہاد کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیامت آنے سے پہلے پہلے دنیا میں اسلامی نظام قائم ہو جائے۔ اس جہاد کا خاص نشانہ بھارت ہے۔ لشکر کے لٹریچر میں ایک

MashalBooks.org

حدیثِ رسول کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ ہندوستان کے خلاف جہاد (غزوۃ الہند) میں شریک ہوں گے ان تک دوزخ کی آگ کا دھواں تک نہیں پہنچے گا۔

تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لشکر تنازعہ کشمیر کے سیاسی حل کے لیے کسی معقول مکالمے میں حصہ دار نہیں بنے گا۔ اس کا نظریہ اس عہد پر استوار ہے تمام عملی مقاصد کے لیے بھارت اور ہندوؤں کے خلاف غیر منتہی جہاد ہونا چاہیے۔ لیکن اس امر کو لازماً تسلیم کیا جانا چاہیے کہ شریعت پر مبنی اسلام پر ایمان رکھنے والے بہت سے کشمیری جنہیں میڈیا اکثر و بیشتر غلطی سے دیگر مذاہب کے مخالفین کے طور پر پیش کرتا ہے وہ لشکر کے بہت سے دعووں کی شدید مخالفت پر مجبور ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر حال ہی میں میری ایک اہل حدیث سکالر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بہ اصرار کہا کہ متذکرہ بالا حدیث غالباً ''وضعی'' ہے۔ اور پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد، عربوں کے توسیع پسندانہ عزائم کے جواز میں گھڑی گئی تھی۔ یہ راویوں کے ایک کمزور سلسلے کی وساطت سے آئی ہے لہٰذا نا قابل اعتبار ہے۔ اس نے کہا کہ لشکر کا یہ موقف کہ ہندو بطور ایک کمیونٹی کے ''دشمنان اسلام'' کی تعریف میں آتے ہیں مکمل طور پر ''غیر اسلامی'' ہے۔ اس نے بہ اصرار کہا ''قرآن ہمیں کسی کمیونٹی پر اس طرح کی چھاپ لگانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ہر مذہب و قوم میں اچھے لوگ ہوتے ہیں، اسلام مسلمانوں کو ان کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کی ہدایت دیتا ہے، ان کے ساتھ بنیادی مسائل مثلاً خدا پر ایمان، اور سب کے لیے سماجی انصاف، نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے انصاف کی بنیاد پر بات کی جانی چاہیے''۔

سوپور کے ایک حالیہ دورے میں میری ملاقات جماعت اسلامی کے ایک حامی، حسن سے ہوئی۔ یہ کشمیر میں سب سے زیادہ فعال اور نمایاں ترین گروپوں میں سے ایک ہے۔ میں نے اسے جماعت کے ایک معروف مفکر کی لکھی ہوئی کتاب میں سے ایک اقتباس سنایا جس میں کہا گیا تھا کہ جتنا ایک مچھلی کے لیے صحرا میں رہنا مشکل ہے، اتنا ہی ایک مسلمان کے لیے ہندوانہ ماحول میں رہنا مشکل ہے۔ اس مفکر کا یہ اصرار بھی تھا کہ کشمیر میں کشمکش سیاست یا قومی خود مختاری کے لیے نہیں بلکہ اسلام اور کفر کے مابین عالمی جنگ سے ہرگز کم نہیں۔ اس طرح کسی سمجھوتے یا کشمیر کی سیاسی حیثیت کے سوال پر سنجیدہ مکالمے کی کوئی

گنجائش نہیں ہے۔

حسن نے میری بات صبر سے سننے کے بعد جواب دیتے ہوئے کہا ''اگر تمام ہندو دشمنانِ اسلام تھے اور اگر مسلمان ہندوؤں کے ساتھ بالکل نہیں رہ سکتے تو پھر ایسا کیوں اور کیسے ہوا کہ بے شمار صوفیا صدیوں پہلے کشمیر میں آ کر رہنے اور تبلیغ کرنے لگے۔ اور ایسے وقت آئے جب یہاں بمشکل کوئی مسلمان پایا جاتا تھا؟'' اس نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا ''یہ کہنا غلط ہے کہ ایک مسلمان کے لیے ایک ہندو معاشرے میں رہنا عملاً ناممکن ہے، اگر ایسا ہوتا تو بھارت میں مسلمانوں کی تعداد پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد سے زیادہ کیوں ہوگئی۔ کیا بھارتی مسلمان کسی بھی صورت میں پاکستانی مسلمانوں سے کمتر ہیں''؟

حسن نے مزید کہا ''ایک مسلمان کا سب سے بڑا فرض ''دعوۃ'' ہے یعنی دوسروں کو خدا کے راستے یعنی مذہبِ اسلام کی طرف بلانا ہے ہمارا ایمان ہے کہ اسلام واحد راہِ نجات ہے۔ اگر غیر مسلم اسلام کو قبول کرلیں تو اس میں ان کی بھلائی ہے، اگر وہ دعوۃ کو ماننے سے انکار کریں تو یہ ان کی اپنی مرضی ہے لیکن دونوں صورتوں میں اسلام ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم ان غیر مسلموں سے جو اسلام کی مخالفت نہ کریں، اور مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے سے نہ روکیں تو ان کے ساتھ انصاف اور حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔ اگر یہ دلیل دی جائے کہ ہم ہندوؤں کے ساتھ نہیں رہ سکتے یا ان سے دوستی نہیں کر سکتے جیسا کہ بعض اسلامی سکالرز اصرار کرتے ہیں تو ہم اپنا مشنری فرض یا دعوۃ کا کام کیسے انجام دیں گے''

ہندوؤں کے بارے میں بعض انتہا پسند مسلم گروہوں کی جامع اور منفی تعمیمات (generalisations) کا حوالہ دیتے ہوئے حسن نے کہا ''یہ گروہ اسلامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اپنے ہندو دشمن زورِ بیان اور کاروائیوں سے وہ ہندوؤں کو اسلام سے مزید پرے دھکیل رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے اب ہندو غلطی سے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام ان کے خلاف نفرت اور تشدد کے جذبات پھیلاتا ہے۔ یہ انتہا پسند گروہ دعوۃ اور تبلیغ کا کام مزید مشکل بنا رہے ہیں، یہ اسلام کی خدمت تو نہیں ہے بلکہ اس کو شدید نقصان پہنچانے کی کوشش ہے۔ یہ لوگ اسلام کا نام استعمال کر کے اپنے ذاتی مقاصد یا پاکستان کے سیاسی عزائم کی تکمیل کر رہے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی بدنام کر رہے ہیں۔

اس دلیل کی ایک قسم تبلیغی جماعت کے بہت سے کشمیری کارکنوں کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔ اس جماعت کی جڑیں دیوبندی روایات میں ہیں۔ اگرچہ تبلیغی جماعت کے کارکن ان عام طریقوں اور عقائد کے خلاف باتیں کرتے ہیں جنہیں وہ ''غیر اسلامی'' یا ''ہندوانہ'' سمجھتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو صرف ''شریعت'' کے احکامات کی پیروی کرنی چاہیے لیکن وہ متشدد اسلام پسندوں کے برعکس عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے۔ نہ ہی وہ اسلامی ریاست کے قیام کو اپنی اولین ترجیح قرار دیتے ہیں۔ فوری طور پر خلافت قائم کرنا ان کے مقاصد میں شامل نہیں۔

میرے خیال میں شریعت پر مبنی اسلام کی ''تبلیغی تشریح'' سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان تعلقات بہتر بنائے جائیں۔ جنوبی کشمیر کے شہر انت ناگ یا اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے ایک تبلیغی کارکن مسعود نے مجھے بتایا ''اسلام دوسروں کے ساتھ اچھے تعلقات کے لیے یہ شرط عائد کرتا ہے کہ وہ لوگ مسلمانوں پر ظلم و تشدد نہ کریں۔ ''انتہا پسند گروہوں کی طرف سے ہندو دشمن رویئے بالکل غیر اسلامی ہیں''۔ اس نے کہا کہ ''تبلیغی جماعت مسلمانوں میں اسلام اور احکاماتِ شریعت کی تبلیغ کرتی ہے اور انہیں باعمل مسلمان بنانے کی کوشش کرتی ہے، ہم غیر مسلموں کے اندر براہ راست مشنری کام نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی ذاتی مثالیں پیش کر کے انہیں متاثر کرتے ہیں۔ اگر ہم ان سے حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آئیں گے جیسا کہ اسلام ہمیں اس کی تلقین کرتا ہے، ممکن ہے کہ وہ اس کو اسلام کی طرف منسوب کریں گے اور پھر اگر خدا نے چاہا تو وہ اسلام قبول کرنے کی طرف مائل ہو جائیں گے۔'' اس نے مزید کہا ''ہمیں ہندوؤں اور دیگر دھرم رکھنے والوں کو خود سے دور کرنے کی بجائے ان سے بہتر تعلقات قائم کرنے چاہئیں، یہ ہمارے دعوتی کام کے لیے ضروری ہے''

تنازعۂ کشمیر کے ''جہاد'' ہونے کے مسئلے پر بھی شریعت پر مبنی اسلام کے علمبرداروں کی رائے منقسم ہے۔ لشکر طیبہ اور جماعت اسلامی کشمیر کے پُر جوش کارکن اسے بذریعہ اسلامی جہاد حل کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بعضوں کا اصرار ہے کہ ان ممالک میں بھی جن میں مسلمانوں کو اپنے مذہبی احکامات پر چلنے کی اجازت ہے، عملی جہاد کا اعلان کیا جا سکتا ہے اور

شروع بھی کیا جا سکتا ہے جو اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہاں ان کے مفہوم کے مطابق اسلامی ریاست قائم نہیں ہو جاتی۔ تاہم یہ رائے صرف ایک محدود انتہا پسند اقلیت کی ہے۔ شریعت پر مبنی اسلام اور ''اسلامی ریاست'' کے وکلا اس موقف سے اختلاف کریں گے۔ اس طرح جماعت اسلامی کے متعدد سرگرم کارکن، (جن سے میں، کشمیر میں سال ہاسال ملتا رہا ہوں) بہ اصرار کہتے ہیں کہ کشمیر کا تنازعہ، مذہب سے ہرگز منسلک نہیں ہے۔ سید علی گیلانی جیسے رہنما کا خیال ہے کہ ''یہ ایک سیاسی کشمکش ہے جو کشمیریوں کے حق خودرادیت کا معاملہ ہے، یہ اسلام اور کفر کے مابین جنگ نہیں ہے'' وہ جماعت اسلامی کے سرگرم لوگوں میں سے ہیں جن سے میری ڈوڈا میں ملاقات ہوئی تھی۔ ایسا موقف مکالمے کے لیے زیادہ گنجائش اور امید کی راہ دکھاتا ہے۔ یہ خالصتاً مذہبی اصطلاحوں سے ہٹ کر سوچنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ جہاں تک ''اسلامی ریاست'' کا معاملہ ہے جماعتِ اسلامی کے اس سرگرم لیڈر نے ''لشکر'' کے موقف سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ایسی ریاست لوگوں کی خواہش کے برعکس وجود میں نہیں آسکتی۔ ''ہمیں اس کے لیے پُرامن طریقوں اور ترغیب سے کام لینا ہوگا۔ اگر لوگوں کی مرضی کے خلاف اسلامی ریاست قائم ہو گئی تو وہ اس کی مخالفت شروع کر دیں گے جس سے منافقت، خوف و ہراس، بے اطمینانی اور مخاصمت پیدا ہو جائے گی۔ جبکہ اسلام ہرگز یہ نہیں چاہتا۔ قرآن کہتا ہے کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں تو لوگوں کو کس طرح جبراً کسی سیاسی نظام کو قبول کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ اسلامی ہو یا کوئی اور۔''

تاہم اسی سانس میں ان صاحب نے کشمیر میں ایک ''اسلامی ریاست'' کے قیام کا کیس پیش کرنا شروع کر دیا جو کہ جماعت کے سیاسی ایجنڈے کا مرکزی نقطہ ہے۔ وہ کہنے لگے ''یہ غیر مسلموں کے لیے بھی ایک مثالی ریاست ہو گی۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا ایسے نظام کے قیام سے جموں و کشمیر کی غیر مسلم اقلیت بغاوت نہیں کر دے گی یا فرار نہیں ہو جائے گی؟ انہوں نے کہا ''نبی اکرمؐ کے زمانے میں ریاست مدینہ میں جس طرح غیر مسلموں نے اپنے حقوق محفوظ پائے تھے، یہاں بھی اسلامی ریاست اگر قائم ہوگئی تو انشاء اللہ وہ خود کو اس میں زیادہ محفوظ پائیں گے کیونکہ اسلام غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ پر

بہت زیادہ زور دیتا ہے۔ یہاں سے غیر مسلموں کا فرار تو بہت دور کی بات ہے بھارت کے دیگر حصوں کے لوگ بھی فرار ہو کر یہاں پہنچنے لگیں گے۔'' انہوں نے میرے شبہات کو سرسری طور پر مسترد کر دیا۔ تاہم اس مسئلے پر میرا اختلاف برقرار رہے، میں اپنی رائے چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا، کہ ان کی یقین دہانیوں نے میرے شبہات کم نہیں کئے۔

جموں و کشمیر میں تبلیغی جماعت کے جن پُر جوش کارکنوں سے میری ملاقات ہوئی کشمیر میں اسلامی ریاست کے قیام کے تصور سے متعلق ان کی بھی کم و بیش رائے یہی تھی۔ کشمیر میں اسلامی ریاست کے لیے جدوجہد پر اصرار کرنے والوں کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے فہم اسلام کے مطابق ایسی ریاست کی مرکزیت کا انکار نہیں کرتے مگر اس آرزو کو اپنا فوری طمح نظر نہیں بناتے۔ اس جواب سے مسئلہ کشمیر کے سیاسی حل کے بارے میں مکالمے اور مصالحت کا ایک امکان ضرور دکھائی دیتا ہے۔

بھدرواہ میں تبلیغی جماعت کے ایک کارکن ندیم نے کہا کہ اگر ہم اپنی ذاتی زندگیوں میں شریعت کا صحیح معنوں میں اتباع نہیں کر سکتے تو ہم دیگر دوائر میں نفاذِ شریعت کے لیے ایک اسلامی ریاست کا کیسے مطالبہ کر سکتے ہیں؟ جیسا کہ ندیم اور اس کے رفقا اس کو ایک تدریجی عمل کے طور پر دیکھتے ہیں، اس کو غیر معینہ مستقبل کے لیے ملتوی رکھا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے ''یہ صرف اس وقت ہوگا جب افراد اور معاشرہ ایمانداری سے شریعت پر عمل شروع کر دیں گے، اس وقت ہم اسلامی ریاست کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اچھے لگیں گے۔ جب تک وہ وقت نہیں آتا ہم ایسی غیر اسلامی حکومت کے تحت رہ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ریاست مسلمانوں کو ان کے عقیدے کے مطابق عمل کرنے کی آزادی مہیا کرے، جیسا کہ انڈیا میں اس وقت ہو رہا ہے۔'' پھر اس نے جلدی میں اس جملے کا اضافہ کیا ''سیاسی اقتدار حاصل نہیں کیا جاتا، یہ ایک تحفہ ہوتا ہے جو اللہ جس کو چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔''

لشکر طیبہ کا اصرار ہے کہ تنازعۂ کشمیر ایک جہاد ہے جس میں تمام مسلمانوں کو اپنی اپنی استطاعت کے مطابق شرکت کرنی چاہیے، تاہم شریعت پر مبنی اسلام کے دیگر وکلا کے مابین اس پر رائے منقسم ہے ان میں اختلاف شرائط سے متعلق ہے۔ یعنی وہ کیا حالات ہوتے ہیں جن کے تحت جہاد کیا جا سکتا ہے۔ جموں کے ایک دیوبندی عالم کا خیال ہے کہ ''صرف

اسلامی ریاست کا سربراہ اعلانِ جہاد کرسکتا ہے، کوئی فرد یا جماعت یہ اعلان نہیں کرسکتی۔''
عملی جہاد ایک غیر اعلان کردہ ''پراکسی وار'' کی صورت میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ منافقت کے مترادف ہوتی ہے جس سے اسلام باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔'' اس نے اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جہاد اس وقت ہوسکتا ہے جب مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے سے روکا جا رہا ہو، لیکن انڈیا میں یہ صورت حال نہیں ہے۔ کشمیر میں جاری کشمکش انڈین مسلمانوں کے لیے حالات سنگین تر بنا رہی ہے کیونکہ اس سے متعصب ہندوؤں کو مزید تقویت مل رہی ہے۔ غالباً انڈیا میں چودہ کروڑ مسلمانوں کی بہبود کشمیر میں ایک کروڑ مسلمانوں کی بہبود سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، جسے ہمیں ہمیشہ ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ لیکن چند انتہا پسند گروپ جو اسلام اور امت مسلمہ کے چیمپین ہونے کے دعویدار ہیں وہ انڈین مسلمانوں کے لیے اپنی کاروائیوں اور زور بیان کے مضمرات کی پرواہ نہیں کرتے۔ اگر کشمیر میں کشمکش ان کے لیے حالات کو خراب تر کر رہی ہے تو انہیں اس کا ضرور خیال رکھنا ہوگا لیکن بدقسمتی سے یہ گروپ ہندوشاونسٹوں کی طرح سیاسی اقتدار میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، سچی مذہبیّت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے اور اپنے مقاصد کے لیے مذہب کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے گریز نہیں کرتے۔''

کسی بھی دوسرے مذہب کی طرح اسلام کی بھی ہمیشہ رنگارنگ تعبیریں کی جاتی رہی ہیں، یہ کسی بڑے پتھر سے تراش کر بنائی گئی واحد عمارت(monolith) کی طرح نہیں ہے جیسا کہ اسے میڈیا کے بحث مباحثوں میں اور انتہا پسند علمبردارانِ اسلام اکثر اپنی تقریروں میں پیش کرتے ہیں۔ ایک ہی مسئلے پر عموماً متناقض بیانات دیئے جاتے ہیں اور ایسے دلائل سے کام لیا جاتا ہے کہ ہر بیان ''اسلام'' کی ترجمانی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کا اعتراف کر لینے سے مختلف اسلامی گروپوں کے مابین قیام امن، آویزشوں کو ختم کرنے، بین المذاہب مکالمے کے فروغ اور اتحاد (بشمول تنازعہ کشمیر) کے لیے مذاکرات زیادہ بامعنی ہو جائیں گے۔ اس نقطے کو ایک طرف تو شریعت پر مبنی اسلام یا صوفیانہ روایاتِ کشمیر کے علمبرداروں کے درمیان فرق واضح کرنے میں اہمیت حاصل ہے اور دوسری جانب زیادہ لفظ پرستانہ شریعت پر مبنی اسلام کے وکیلوں کی شناخت میں اہمیت حاصل ہے۔ تاہم مؤخر الذکر قسم

MashalBooks.org

(کیٹیگری) کے گروہوں کے مابین اختلافات کے کئی رنگ پائے جاتے ہیں۔ اس کا اعتراف ممکنہ شرکائے مکالمہ کی تلاش کے نقطۂ نظر سے بھی بہت اہمیت رکھتا ہے جو تنازعۂ کشمیر کے حل اور خطے میں آباد مذہبی کمیونٹیز کے مابین پُرامن بقائے باہمی کی راہیں تلاش کرنے میں مددگار بن سکیں۔ اگرچہ اس کی جڑیں اس پختہ یقین کے اندر پیوست ہیں کہ اسلام واحد ذریعۂ نجات ہے، شریعت پر مبنی اسلام کے اندر کافی تنوّع پایا جاتا ہے ان میں چند ایسے متغیرات بھی شامل ہیں جو ایمان کی ایسی تعبیریں پیش کرتے ہیں کہ ان پر مزید مذاکرات کی ضرورت ہے، ان کے درمیان دوسروں سے کہیں زیادہ پُرامن بقائے باہمی مطلوب ہے۔ اس حقیقت کا لازماً اعتراف ہونا چاہیے اور اس سے تنازعہ کشمیر کے حل کے لیے ایک دینی ذریعے کے طور پر کام لیا جانا چاہیے۔

[26، ستمبر 2006]

MashalBooks.org

کشمیر میں زلزلہ، دہلی میں بم دھماکے اور ہمارا ردّعمل

اگر بھارتی اخبارات قابل اعتبار ہیں تو تنگدھر، اُوڑی اور انڈیا کے زیر انتظام کشمیر کے دیگر حصوں میں بالکل خیر خیریت ہے جو کہ حالیہ زلزلوں میں تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ جن میں 1500، افراد ہلاک اور100,000 بے گھر ہوئے تھے۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے امدادی کام کئے ہیں اور پریس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ لائن آف کنٹرول کے اس پار ملک کے اس دورافتادہ کونے میں رہنے والے لاکھوں لوگوں کی بربادی اور حالِ زار کے بارے میں ''مین سٹریم'' کی یہ بے توجہی بے حد تشویشناک ہے۔ لائن آف کنٹرول جو انڈیا اور پاکستان کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے، اس کے پرلے حصے میں مچنے والی تباہی کے بارے میں پریس میں ایک سرسری ذکر بھی نہ شائع ہونا بے حسی کا افسوسناک مظاہرہ ہے۔ میں پچھلے ہفتے تنگدھر گیا تو وہاں میری ملاقات ایک استاد حسین سے ہوئی، اس نے کہا کہ چند سال پہلے ''کچھ'' (گجرات سٹیٹ) میں زلزلہ اور جنوبی ہند میں سونامی آنے پر انڈین این جی اوز اور کارپوریٹ ہاؤسز نے جس فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا، کشمیر کے زلزلہ کے متاثرین سے اس کے بالکل برعکس رویئے سے کام لیا ہے۔ اس نے اس بے حسی کا جو سبب بتایا وہ غالباً یہ حقیقت تھی کہ کشمیر میں متاثرینِ زلزلہ تقریباً سارے کے سارے مسلمان تھے۔

اس نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم کشمیری متاثرینِ زلزلہ کے لیے کپڑے وغیرہ اکٹھے کرنے کے لیے نکلے تو بنگلور میں ایک پڑوسی نے مجھے دیکھتے ہی دروازہ زور سے دے مارا اور نہایت بے شرمی سے کہا ''وہ سب مسلمان ہیں، یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے

امداد جمع کرتے ہوئے کئی دیگر افراد سے بھی ایسے ہی جملے سننے کو ملے مگر امداد نہ ملی۔ مجھے اس بات پر مزید صدمہ ہوا کہ اپنے ہی اردگرد سے جن لوگوں نے زلزلہ زدگان کے لیے امداد بھیجی ان میں سے اکثریت مسلمانوں کی تھی کیونکہ اس سے اس بارے میں مزید گواہی مل گئی کہ بیشتر لوگوں نے زلزلے کو فرقہ وارانہ رنگ میں لیا تھا۔ تاہم یہ زیادہ حیرت انگیز بات نہیں تھی کیونکہ بنگلور کی ہندو کمیونٹی کے متوسط اور بالائی طبقے کے زیادہ تر افراد کے لیے زلزلۂ کشمیر انسانی المیہ نہیں محض مسلمانوں کا ایک معاملہ تھا۔ میرے ایک پڑوسی نے انتہائی سفاکانہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ زلزلہ زدگان اسی کے مستحق تھے کیونکہ وہ دہشت گردی کی حمایت کرتے تھے اور بھارت سے الگ ہونے کی وکالت بھی کرتے تھے۔

ایسے گہرے تعصّبات غالباً اپنے اثرات رکھتے ہیں، یہ کوئی چھوٹی بات نہیں۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ زلزلہ جیسے ایک انسانی بحران میں بہت کم ''این جی اوز'' نے امدادی کام کیا جبکہ کشمیر اور بھارت کے دیگر حصوں سے مسلم تنظیموں کے علاوہ بعض مسیحی گروپوں اور بڑی بڑی بین الاقوامی تنظیموں نے کشمیر کے زلزلہ زدہ حصوں میں امدادی سرگرمیوں میں حصہ لیا، اس سے ایک واضح تاثر پیدا ہوتا ہے کہ بیشتر بھارتی این جی اوز کے لیے زلزلہ زدگان کوئی اولین ترجیح نہیں تھے اس سے خطے میں جاری امدادی کاموں سے ان کی عملاً غیر حاضری کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔

تمام مسلمانوں پر ایک ہی برش سے تارکول پھیر دینے اور سب کو دہشت گردوں کے ہمدرد قرار دے دینے والے متعصب ہندو پڑوسیوں اور ان جیسے دیگر لوگوں کو بہت کم معلوم ہے کہ اوڑی اور تنگدھر کے جو لوگ زلزلے سے بہت بُری طرح متاثر ہوئے ہیں ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہیں عسکری تحریک سے بمشکل ہی کوئی ہمدردی ہوسکتی ہے۔ اس بنا پر ہم یہ دلیل نہیں لاتے کہ انہیں انسانی بنیادوں پر امداد دینے کی اشد ضرورت، اس صورت میں کم ہو جائے گی اگر ان کے سیاسی رجحانات کچھ مختلف ہوتے۔ جموں و کشمیر کے ان دور افتادہ حصوں میں رہنے والوں میں سے بیشتر پہاڑی زبان بولنے والے مسلمان ہیں۔ یہ نسلی اور ثقافتی لحاظ سے وادیٔ کشمیر کے مسلمانوں سے خاصے مختلف ہیں۔ جیسا کہ تنگدھر میں مجھ سے ملنے والے بے شمار فوجیوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے زور

دے کر کہا کہ اس خطے میں عسکریت اس حقیقت کے باوجود جڑیں نہیں پکڑ سکی کہ یہ لائن آف کنٹرول کا علاقہ ہے جس کے پار انہی کے ہم نسل لوگ رہتے ہیں۔ مجھے یہاں تک بتایا گیا کہ یہ لوگ سرحد پار سے ہونے والی مداخلت کے خلاف کاروائیوں میں فوج کی مستعدی کے ساتھ مدد کرتے ہیں، اور ان کے خاندانوں کے کئی افراد فوجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مقامی لوگوں کی بڑی اکثریت کے کشمیر میں جاری عسکریت میں ملوث ہونے سے دور رہنے کے کئی اسباب ہیں، ایک سبب تو یہ ہے کہ انہیں اس بات کا شعور ہے کہ لائن آف کنٹرول کی بھارتی جنگ کے اقتصادی حالات دوسری جانب کے حالات سے کافی بہتر ہیں۔ دوسرا سبب مقامی معیشت کو سہارا دینے میں فوج کا کردار ہے۔ تیسرا یہ کہ انہیں ''پسماندہ طبقے'' کا درجہ دے کر سرکاری ملازمتوں میں مواقع دیئے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ ریاست کی غیر کشمیری کمیونٹیز اور غیر مسلم اور مسلم دونوں کے اندر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ فوجی نقل و حرکت کو کشمیریوں کا غلبہ برقرار رہنے اور اس کے فروغ پانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ زلزلہ زدگان کو اس لئے مستحق امداد نہیں سمجھا جاتا کہ وہ مبینہ طور پر دہشت گردوں کے حامی ہیں، نہ صرف غیر انسانی ہے بلکہ واقعاتی طور پر بھی غلط ہے اور یہ صرف ایک بے ہودہ دعویٰ کرنے والوں کی جہالت کی غمازی کرتا ہے۔

این جی اوسیکٹر کی ناموزوں کارکردگی کے مقابلے میں فوج نے سینکڑوں خاندانوں کی امداد کے لیے مستعد کردار ادا کیا ہے۔ بالخصوص زلزلے کے فوراً بعد انہوں نے بحالی کا کافی کام کیا، میں نے جتنے مقامی لوگوں سے ملاقات کی، انہیں فوج کے شکرگزار ہی پایا۔ یہاں میرے اپنے بنگلور کے علاقے اور مضافات کے لوگوں کے لیے ایک سبق پایا جاتا ہے جو کشمیر کے بھارت کے اٹوٹ رنگ کی بات کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ ایسے مشکل وقت میں کشمیریوں کی مدد سے انکار کر دیتے ہیں جب ہزاروں بے گھر لوگ آنے والی سردیوں کی سختیوں میں ناقابل بیان مشکلات سے دوچار ہونے والے ہیں۔ اب ان کے کشمیریوں کے دل جیتنے کے دعووں کی آزمائش ہو رہی ہے اگر انڈین سول سوسائٹی تنظیمیں اس بے پناہ

انسانی المیئے کا جواب سرد مہری سے دیتی رہیں گی تو اس آزمائش کا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ کشمیریوں کے دل جیتنے کے لیے اس سے بہتر کون سا طریقہ ہو سکتا ہے کہ زلزلہ زدگان کی فیاضی سے مدد کی جائے جن کی حالتِ زار ہمارے تصور سے مکمل طور پر باہر رہی ہے؟ اس کی شہادت وہ زلزلہ زدگان دیتے ہیں جنہیں تھوڑی بہت امداد ملی ہے۔ جیسا کہ احمد نے کہا (جس سے میری اوڑی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا گھر زلزلے میں تباہ ہوا تھا)، ''اگر فوج امداد نہ کرتی تو بہت سی جانیں ضائع ہو چکی ہوتیں۔'' یا جیسا کہ تنگدھر کے قریب کے ایک گاؤں ''پرادا'' کے ایک شخص نے مجھ سے کہا ''ہمیں کچھ امداد این جی اوز سے اور کچھ فوج سے ملی لیکن لائن آف کنٹرول کے پار پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے بیسیوں دیہات کو ان کی ریاست یا ان کی فوج سے کچھ بھی نہیں ملا''۔

فوج اور چند ایک این جی اوز کی مساعی سے پیدا ہونے والی اس ابتدائی نیک نامی کو مزید وسعت دی جانی چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور کشمیر میں ایک لاکھ سے زائد تباہ حال افراد کی حالتِ زار کو نظر انداز کیا گیا تو وہ ان آنے والی سردیوں میں فاقوں میں مبتلا ہو کر موت کے منہ میں چلے جائیں گے، اس سے اسلامی انتہاپسندوں کے ہاتھ مزید مضبوط ہوں گے۔ انہیں موقع مل جائے گا کہ وہ اسے بھارت کے ہندوؤں کی ایک اور ''دغا بازی'' اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دلی نفرت کے ایک اور ثبوت کے طور پیش کریں۔ ہم ایک لاکھ افراد کو عسکریت پسندوں کے ریکروٹ بننے پر رضا مند ہوتے نہیں دیکھ سکتے، جبکہ ایسا کرتے ہوئے ان کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوگا۔ اگر بھارتی ریاست اور سول سوسائٹی نے ان کی فوری ضرورتیں پوری کرنے میں کوتاہی کی تو عسکریت پسند اسلامی گروہ ایسا کر ڈالیں گے جیسا کہ وہ لائن آف کنٹرول کے پار پہلے سے ہی کر رہے ہیں۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق ان امدادی کاموں میں لشکر طیبہ قائدانہ کردار ادا کر رہا ہے۔

کشمیر میں عسکری گروپ انڈین ''این جی اوز'' کے لیے امدادی کام کرنا آسان نہیں بنا رہے ہیں، جب میں نے سرینگر میں ایک ایسے شخص سے ملاقات کی، جو لشکر طیبہ کے لیے اپنی ہمدردیوں کو ڈھکی چھپی بات نہیں رکھتا تھا، اس نے نوحہ کرنے کے انداز میں کہا کہ

انڈین سول سوسائٹی نے زلزلہ زدگان کی تکالیف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا ایسا کیوں نہ ہو جب لشکر ساتھ ساتھ کشمیر کو مسلح جہاد کے ذریعے انڈیا سے ''آزاد'' کرانا چاہتا ہے۔ اگر کشمیر انڈیا کا حصہ نہیں ہے جیسا کہ لشکر اصرار کرتا ہے تو پھر بھارتیوں سے کیوں توقع رکھتا ہے کہ وہ کشمیریوں کو بچانے کے لیے آگے بڑھیں؟ میں نے اس سے پوچھا کہ انڈین ''این جو اوز'' سے زلزلہ زدگان کی امداد کی معقولیت کے ساتھ توقع رکھنا کسی حد تک بجا ہے جب کشمیر میں فوجی گاڑیوں اور مورچوں پر عسکریت پسند روزانہ حملے کر رہے ہیں؟ میں نے دلیل دیتے ہوئے کہا کہ وہ بھارتی شہریوں سے زلزلہ زدگان کی امداد کی کیسے امید کر رہے ہیں جب لشکر، جسے مسلمانوں کے لیے ایک ماڈل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ تمام ہندوؤں کے چہروں پر ایک ہی برش سے تارکول مل رہا ہے، انہیں ''شر''، مکروہ اور شیطان کے ایجنٹ بھی قرار دے رہا ہے؟

دہلی میں تباہ کن دھماکوں نے کشمیر میں انسانی بحران میں ایک نئی وسعت پیدا کر دی ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کا منصوبہ خوفناک لشکر طیبہ نے تیار کیا ہو گا۔ اگر یہ اندازہ درست ہے تو یہ بمشکل ہی حیرت انگیز بات ہو گی کہ یہ دھماکے زلزلے کے بعد فوراً کیوں کرائے گئے۔ اس سے ایک زوردار پیغام دینا مقصود ہے کہ دہشت گرد زلزلے کے باوجود ناکارہ نہیں ہوئے بلکہ اپنی جگہ موجود ہیں اور جب چاہیں ضرب لگا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ دھماکے کشمیر سے باہر کی این جی اوز کے امدادی کاموں کو مزید مشکل بنا دیں، بنگلور میں میرے پڑوسیوں کی طرح کے لوگ اب اپنے اس عزم میں مزید سخت ہو جائیں گے کہ زلزلہ زدگان کو بالکل امداد نہیں پہنچنے دی جائے گی۔ بھارت کے دیگر حصوں کی امدادی ٹیمیں حملے کے خوف سے کشمیر کا سفر کرتے ہوئے دو دفعہ سوچیں گی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لشکر جیسے گروہ بالکل یہی چاہتے ہیں۔ لائن آف کنٹرول کی پاکستانی سائیڈ سے انڈین سائیڈ میں امدادی کاموں اور طبی سہولتوں کی فراہمی کے لیے لوگوں کو جانے دینا یا غیر مسلم انڈین تنظیموں کو کشمیر میں امدادی کام کرنے کی اجازت دینا لشکر جیسے گروہوں کے لیے انتہائی قابل نفرت کام ہے جن کی آئیڈیالوجی ہندوؤں سے بے پناہ

MashalBooks.org

نفرت پر مبنی ہے۔ کوئی کوشش جس سے انڈیا اور پاکستان کے درمیان یا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کم ہوتی ہو انہیں فوراً اسلام دشمن سازشیں دکھائی دیتی ہے کیونکہ وہ واضح طور پر لشکر کے نظریۂ عالم کے بنیادی اصولوں کو تہس نہس کر دیتی ہے۔ ہندو خواہ وہ فوجی ملازم ہو یا سویلین، اس کی طرف سے زلزلہ زدہ کشمیری مسلمانوں کی مدد ہونا عسکری اسلام پسندوں کے اس نظریئے کے لئے ایک زبردست چیلنج ہو گی کہ سارے ہندو ''شر'' ''نیچ'' اور ان کے خیال کے مطابق ''مسلم دشمن'' ہیں۔

انڈیا کے زیر انتظام کشمیر میں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ بے گھر افراد کو بیماریوں، فاقوں اور آنے والی سردیوں میں موت کے خطرات کا سامنا ہے اور چونکہ اسلامی عسکریت پسند، ہندوتوا کے فاشسٹ اور انڈین پریس کا ایک حصہ ان افراد کو ایک بے پناہ انسانی المیے کے شکار سمجھنے کی بجائے بنیادی طور پر مسلمان سمجھتا ہے، ان کی حالت کے بارے میں ہمارا ردّعمل حسرت ناک طور پر بے حسّی کا ہے۔ فرقہ وارانہ اصطلاحوں میں جکڑے جانے کی وجہ سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے انہیں مسلسل درپیش مصائب انہیں ہمارے تصور اور ضمیر کے دائرے سے باہر پہنچا دیں گے۔ کشمیریوں کے لیے ہمارا بہ تکرار اور انتھک اظہار تشویش کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔

[30، اکتوبر 2005]

MashalBooks.org

دہلی کے بم دھماکے اور لشکر کا جہادی ایجنڈا

دہلی میں پچھلے ہفتے ایک خوفناک بم دھماکہ ہوا جس کی ذمہ داری ایک غیر معروف تنظیم ''اسلام محاذ'' نے قبول کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس تنظیم کی سرپرستی پاکستان میں لشکر طیبہ کرتی ہے۔ ایسے سنگدلانہ خوف وہراس پھیلانا ''لشکر'' کا عام وطیرہ ہے جو اس کی غیر مسلموں سے نفرت کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ ان لوگوں کو اسلام دشمن سمجھتا ہے۔

لشکر ''مرکزِ دعوۃ وارشاد'' کا مسلح بازو ہے، یہ اہل حدیث مکتبۂ فکر سے وابستہ ہے جو کہ کم وبیش سعودی وہابیوں کا ہم خیال ہے۔ یہ کشمیر میں سرگرمِ عمل طاقتور عسکری تنظیم ہے۔ کشمیر کے معاملات میں اس کے ملوث ہونے کا سلسلہ 1990 کی دہائی کے اوائل میں شروع ہوا جب پاکستان نے ''جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ'' (JKLF) کے مقابلے کے لیے بنیاد پرست انتہا پسندوں کی سرپرستی شروع کردی۔ یہ فرنٹ بھارتی راج کے خلاف مسلح جدوجہد کے آغاز کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اس کا خودمختار اور سیکولر کشمیر کا ایجنڈا واضح طور پر پاکستانی ایسٹیبلشمنٹ کی پسند کا نہ تھا جو کہ بنیاد پرست اسلام پسندوں کی تنظیموں کو اپنے زیادہ قابل اعتماد حلیف سمجھتی ہے کیونکہ یہ تنظیمیں کشمیری نیشنل ازم کی مخالفت اور کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی وکالت کرتی ہیں۔ لشکر کے قیام میں اسامہ بن لادن کے قریبی دوست عبد اللہ عزام (مرحوم) کا بھی کلیدی کردار تھا جو اس وقت انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے منسلک تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لشکر کے لیے فنڈز سعودی عرب اور پاکستان کی خفیہ ایجنسی انٹر سروسز انٹیلی جنس کی طرف سے آتے ہیں۔

دیگر بنیاد پرست اسلامی تنظیموں کی طرح لشکر طیبہ بھی اسلام کو ایک مکمل ضابطۂ حیات

MashalBooks.org

قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں کا شریعت کی شکل میں احاطہ کرتا ہے۔ اسلامی نظام کے لیے ایک ''اسلامی ریاست'' کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ شریعت کو بطور ملکی قانون نافذ کر سکے۔ لشکر کے ایک نظریاتی حامی کے الفاظ میں ''اگر ایسی ریاست وجود میں آجائے اور تمام مسلمان شریعت کے مطابق عمل کرنے لگیں تو مسلمان پوری دنیا کو کنٹرول کر کے اپنی بالادستی قائم کر سکیں گے۔''

چونکہ دنیا بھر کے مسلمان عالمی اسلامی ''امّہ'' کے ارکان ہیں، اس لیے لشکر کا اصرار ہے کہ ایک عالمگیر اسلامی ریاست قائم ہو اور ایک خلیفہ ہو جو سب اہل ایمان پر حکمرانی کرے۔ اسلامی ریاست کے لیے جدوجہد کئی شکلیں اختیار کر سکتی ہے، پُرامن بھی اور متشددانہ بھی۔ ''لشکر'' والوں کا کہنا ہے کہ اسلام امن و ہم آہنگی کا مذہب ہے، اس لیے وہ شر اور بدنظمی کے خاتمے کا حکم دیتا ہے اور سب کو امن فراہم کرنے پر زور دیتا ہے، نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری انسانیت کے لیے بھی امن کا خواہاں ہے۔ تاہم یہ مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو غیروں کے تشدد و جبر کا نشانہ بننے سے بچانے کے لیے مسلح جدوجہد، یا جیسے وہ کہتے ہیں جہاد کریں۔ لشکر کے نقطۂ نظر کے مطابق آج دنیا بھر میں یہی صورت حال ہے۔ اسلام کے دفاع اور ظلم کا نشانہ بننے والے مسلمانوں کے دفاع کو جدو جہد آزادی کہا جاتا ہے۔ لشکر والوں کے نزدیک یہ جدوجہد اسلام کو دنیا بھر میں پھیلانے یا ''دنیا پر چھا جانے'' کا ایک ذریعہ بھی ہے کیونکہ بقول ان کے، اسلام واحد سچا مذہب ہے۔ لشکر کا اصرار ہے کہ ''مسلح جہاد اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب اسلام بطور نظریۂ زندگی پوری دنیا پر غالب آجائے اور اللہ کا قانون ہر جگہ نافذ ہو جائے۔''

اس جدوجہد کے دوران توقع کی جاتی ہے کہ اس کا دوسری ریاستوں اور ان کی آئیڈیالوجیز کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا رہے گا۔ اس تصادم کی کیفیت کو پُرامن ڈپلومیسی کے ذریعے دور کیا جائے گا لیکن اگر اس میں ناکامی ہوئی تو لشکر کے لیے واحد کھلا راستہ جہاد رہ جائے گا۔ اس مفہوم میں، لشکر اپنے جہاد کو اپنی سرکاری ویب سائیٹ میں ''فارن پالیسی آف اسلامک سٹیٹ'' قرار دیتا ہے۔

مسلح جہاد، لشکر کی تحریروں اور اعلانات کا عام موضوع اور اس کی گفتگوؤں کا نمایاں

ترین نقطہ ہے۔ اگرچہ اسے ایمان کے ''پانچ ستونوں'' میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لشکر کے فہمِ اسلام کا ایک مسلّمہ مظہر ہے۔ یہاں تک کہ اس کا مطالعۂ اسلام اس کے اپنے سیاسی منصوبے کی پیداوار محسوس ہوتا ہے۔ لشکر کے ترجمانوں کی تحریروں اور تقریروں میں جہاد کا ذکر غیر مسلموں کے خلاف ایک پُر تشدد مہم کے موضوعِ بحث کے طور پر آرہا ہے جنہیں وُہ مسلمانوں پر ظلم و جبر کے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ لشکر کی ویب سائیٹ کا دعویٰ ہے ''اس موضوع پر اتنا زیادہ زور دیا گیا ہے کہ بعض شارحین و مفسرینِ قرآن کا خیال ہے کہ قرآن کا موضوع ہی جہاد ہے۔''

لشکر اپنے جہادی پروگرام کو نجات دہندہ منصوبے کے طور پر پیش کرتا ہے اور بہت سے مسلمانوں کے مضطرب احساسات کو جہاد کی طرف لاتا ہے۔ لشکر کے ویب سائیٹ کا دعویٰ ہے کہ ''آج کے مسلمان ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کے جبر و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں آپ جہاں بھی دیکھیں تو یہی پائیں گے ہر جگہ غیر مسلم مسلمانوں کو غلام بنانے اور تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ان ''دشمنوں'' سے بچانے کے لیے ایک ''مستحکم بلاک'' کو تشکیل دیں۔ اگر تمام پُرامن ذرائع ناکام ہو جائیں تو انہیں اپنی آزادی کے لیے مسلح جہاد شروع کرنا پڑے گا۔ مجوزہ بلاک کی قیادت پاکستان اور سعودی عرب مشترکہ طور پر کریں اور مکہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں۔

لشکر کا خیال ہے کہ ماضی میں مسلم اقتدار کا اصل راز ہی جہاد تھا جس کی بدولت دنیا مسلمانوں کے زیرِ اقتدار آگئی لیکن جب مسلمانوں نے جہاد اور دیگر احکاماتِ اسلام کو ترک کیا تو وہ رفتہ رفتہ زوال کی طرف لڑھکتے چلے گئے۔ لشکر کے افکار کے مطابق موجودہ حالاتِ دنیا کے تحت جہاد بہت ضروری ہو گیا ہے جبکہ تمام مسلمانوں کے لیے یہ ایک مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں غیر مسلم ''ظالموں'' کے خلاف کسی نہ کسی طریقے سے جہاد میں شریک ہوتے رہنا چاہیے۔ ہر شخص جہاد میں اپنا ایک مخصوص کردار ادا کر سکتا ہے۔ مسلح جہاد کرنے والوں کو خدا نے، دنیا اور آخرت دونوں میں اجر دینے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ انہیں نہ صرف جنت میں اعلیٰ مقام دیا جائے گا بلکہ دنیا میں بھی عزت دی جائے گی کیونکہ جہاد بقول ترجمانِ لشکر مالیاتی اور سیاسی مسائل بھی حل کرتا ہے۔

MashalBooks.org

لشکر کشمیر میں مسلح جہاد کو دنیا بھر میں کفر کی طاقتوں کے خلاف جہاد شروع کرنے کی پہلی منزل کے طور پر دیکھتا ہے اور مسلمانوں سے کہتا ہے کہ وہ یہ عزم کریں کہ وہ پوری دنیا کو فتح کرنے سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ انڈیا کے زیر انتظام کشمیر میں لشکر کے سابق امیر قاری عبدالوحید نے کہا ''ہم جہاد کے ذریعے آزادی اور اسلام کا پرچم بلند کریں گے'' نہ صرف کشمیر میں بلکہ پوری دنیا میں۔'' اسی طرح لشکر کے مرکز کے شعبہ تعلقات عامہ کے انچارج نذیر احمد نے اعلان کیا کہ ''خدا نے چاہا تو کشمیر کے ذریعہ ہونے والے جہاد کی بدولت اسلام ساری دنیا پر غالب آجائے گا۔''

لشکر کے رہنماؤں کی گفتگو کے مطابق کشمیر میں جاری کشمکش کو انڈیا اور پاکستان کے درمیان محض علاقائی جھگڑا نہیں سمجھا جانا چاہیے، اسے دو مختلف اور متصادم نظریات کے درمیان جنگ سمجھنا چاہیے ایک طرف اسلام ہے اور دوسری طرف کفر ہے۔ یہ ان دونوں کے درمیان برپا ایک طویل کشمکش کا محض ایک باب ہے، یہ کشمکش گزشتہ چودہ سو برس سے ہندو مسلم تاریخ میں اس وقت سے دکھائی دے رہی ہے جب پیغمبر اسلام دنیا میں تشریف لائے۔ جیسا کہ انہوں نے ایک دعوے کے مطابق انڈیا کو جہاد کا خاص نشانہ بنایا تھا۔

لشکر کے لیڈر محمد ابراہیم سلف نے دعویٰ کیا کہ پیغمبر اسلام نے اعلان کیا تھا کہ ''جو کوئی غزوۂ ہند میں شریک ہوگا، اللہ اسے آتشِ دوزخ سے آزاد کر دے گا۔''

لشکر مسئلہ کشمیر کی جڑیں، ان واقعات میں پاتا ہے کہ یہاں کے مسلم حکمرانوں کو جبراً ہٹا دیا گیا تھا۔ پہلے انہیں سکھوں نے اور پھر ڈوگروں نے برطانیہ کی مدد سے ہٹایا۔ بھارت (ہندوؤں) نے 1947 میں کشمیری مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا کر کشمیر پر قبضہ کیا۔ لشکر کے ویب سائیٹ میں الزام لگایا گیا ہے کہ ''یہ صورت حال ہندومت کی تعلیمات کا براہ راست اور منطقی نتیجہ ہے کیونکہ ان کے مذہب میں اسلام کے لیے کوئی رحم یا ہمدردی نہیں ہے۔'' لشکر کا موقف ہے کہ مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ہندو جابروں کے خلاف جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، اس لیے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو غیروں کی مدد سے اور دہشت گردی سے کشمیر کے اقتدار سے محروم کیا تھا۔ لشکر نے تمام ہندوؤں پر ایک برش سے سیاہ رنگ پھیرتے ہوئے انہیں دہشت گرد، دغاباز، بزدل اور دشمن قرار دیا۔ اس لشکر کے

سربراہ حافظ محمد سعید نے اعلان کیا'' درحقیقت ہندو ایک کمینہ دشمن ہے، اس سے نمٹنے کا وہی طریقہ ہے جو ہمارے آباؤ اجداد نے انہیں کچلنے کے لئے استعمال کیا تھا، ہمیں بھی وہی کچھ کرنا چاہیے۔''

حافظ محمد سعید نے بھارت کو لشکر کے ذریعے خصوصی نشانہ بناتے ہوئے اعلان کیا کہ ''جہاد صرف کشمیر کے لیے نہیں، یہ سارے انڈیا کے لیے ہے۔'' لشکر جہاد کو کشمیر کے بارڈر سے پار پورے انڈیا میں پھیلتے ہوئے دیکھتا ہے، اس کا آخری مقصد ان سب علاقوں کو واپس لینا ہے جو پہلے مسلمانوں کے زیر کنٹرول ہوا کرتے تھے۔ اس کا نعرہ ہے کہ جہاد کے ذریعے ''عظیم تر پاکستان'' قائم کیا جائے۔ چنانچہ حافظ محمد سعید نے نومبر 1999 میں ایک بہت بڑے اجتماع میں اعلان کیا کہ ''آج میں بھارت کے ٹوٹ جانے کا اعلان کرتا ہوں انشاء اللہ۔ ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک پورا بھارت پاکستان میں شامل نہیں ہو جاتا۔'' اسی موقع پر لشکر کے ایک سینئر عہدیدار اور اس کے ترجمان رسالے کے ایڈیٹر امیر حمزہ نے فلک شگاف انداز میں کہا: ''ہمیں بھارت کو توڑ دینا چاہیے، بلکہ اس کا صفایا کر دینا چاہیے۔'' جو لوگ اس بھارت مخالف جہاد میں حصہ لیں گے ان سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے گا اور جنت میں شاندار محلات ''دشمنانِ اسلام'' اسلام کے خلاف لڑتے ہوئے مارے جانے والوں کا انتظار کر رہے ہیں۔

اگر دہلی کے بم دھماکوں کے پیچھے واقعی لشکر والوں کا ہاتھ تھا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لشکر کی بھارت دشمن اور ہندو دشمن اپیلیں خالی خولی الاپ نہیں تھیں اور یہ کہ یہ انتہائی خطرناک عزائم ہیں جو دہشت گردی کو کشمیر کے پار باقی ماندہ بھارت میں بھی پہنچا دیں گے، ان سے ہندو مسلم اختلافات کی آگ بھڑک اٹھے گی اور تنازعہ کشمیر مزید بے قابو ہو جائے گا۔

[31، اکتوبر 2005]

MashalBooks.org

دنیا کے نام ''حمید'' کا پیغام: ایک کشمیری کی طرف سے ہوشمندی کی اپیل

چند ماہ قبل مجھے کسی صاحب کی طرف سے ایک مفصل ''ای میل'' پیغام ملا تھا، جسے میں حمید کا نام دوں گا۔ اس نے صوفی ازم پر لکھا ہوا میرا ایک آرٹیکل پڑھا تھا جسے میں نے ویب سائیٹ پر جاری کر دیا، اسی سے اس نے میرا ای میل حاصل کیا تھا۔ حمید کے خط کا پیغام یہ تھا:

''پیارے بھائی..... اجازت دیجئے کہ میں اپنا تعارف کراؤں۔ میرا نام حمید ہے اور اب میں پاکستان میں رہ رہا ہوں۔'' پھر اس نے لکھنا شروع کیا کہ وہ کون ہے اور مجھے کیوں لکھ رہا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ کشمیر کے اس حصے سے تعلق رکھتا ہے جو بھارت کے زیر انتظام ہے اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ دس سال سے زائد عرصہ پہلے جب کشمیر میں عسکری تحریک زوروں پر تھی ایک خاص عسکری تنظیم نے اس سے رابطہ قائم کیا اور اسے سرحد پار کر کے پاکستان آنے اور فوجی تربیت حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اسے بتایا گیا کہ بھارت کو بہت جلد کشمیر سے باہر دھکیل دیا جائے گا۔ اور ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے گی، پہلے کشمیر میں اور بعد میں ہر جگہ پر۔ پھر دنیا بھر کے مسلمان اس کے دائرے کے اندر آ جائیں گے۔ دشمنانِ اسلام کچل دیئے جائیں گے اور مسلمان اپنی عظمت رفتہ دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ وہ اس یقین سے سرشار تھا کہ اگر اس نے اپنی زندگی بھارت کے خلاف جہاد میں قربان کر دی تو جنت میں اسے ایک شاندار محل ملے گا جس میں

بہت سی کنواری حوریں اس کی خدمت پر مامور ہوں گی۔

حمید سترہ اٹھارہ برس کا ایک حساس نوجوان تھا، اس نے اپنے کئی کشمیری ساتھیوں کو بھارتی سپاہیوں کے ہاتھوں بے دردی سے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ ایک بار ایک سپاہی نے اسے بلاوجہ زدوکوب کر دیا تھا، یہ وہ دن تھے جب بھارتیوں نے ایک عسکریت پسند کی تلاش میں گاؤں پر ہلّہ بول دیا تھا۔ پاکستان جا کر فوجی تربیت حاصل کرنا، اور پھر واپس آ کر بھارت کے خلاف جنگ کرنا، اسے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تذلیل کا بدلہ لینے کا واحد راستہ دکھائی دیتا تھا۔ بھارت نے کئی عشروں سے ان کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے خوشی خوشی نوجوانوں کی ایک ٹولی کے ہمراہ پاکستان جانے کے وعدے کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ اس طرح وہ سب کپواڑہ کے دشوار گزار پہاڑی درّوں میں سے ہوتے ہوئے پاکستان کے زیر انتظام کشمیر میں جا پہنچے۔

حمید نے تین مہینے صوبہ سرحد کے ایک دُور افتادہ ٹریننگ کیمپ میں گزارے جسے ایک عسکریت پسند اسلامی گروہ چلا رہا تھا۔ وہاں اسے کئی مختلف قسم کے ہتھیار استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ بھارت سے شدید نفرت کی غذا بھی کھلائی جاتی تھی۔ زیر تربیت لڑکے ہر شام ایک مسجد میں جمع ہوتے جس میں لشکر طیبہ سے وابستہ ایک عالم بھارت کے خلاف اظہار نفرت کرتا اور تمام ہندوؤں کو اسلام کے بدترین دشمن قرار دیتے ہوئے کہتا کہ اسلام دنیا پر حکمرانی کے لیے آیا ہے محکوم بننے نہیں آیا۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتا کہ غیر مسلم، مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔

تربیتی عرصہ مکمل ہونے والا ہی تھا کہ حمید کے دل میں شدید شکوک و شبہات جنم لینے لگے۔ اگرچہ وہ بھارتی فوج کا سخت مخالف تھا مگر ہندوؤں سے بطور ہندو اس کے دل میں کوئی نفرت نہیں تھی۔ پیچھے سکول میں اس کے کئی قریبی دوست ہندو تھے۔ اس کا پسندیدہ ترین استاد ایک ہندو تھا جو اس سے بیٹے کی طرح سلوک کرتا تھا۔ اس کے اکثر ہندو دوست اس کے ہمراہ ایک کشمیری بزرگ حضرت نورالدین نورانی یا نندرشی کے مزار پر جایا کرتے تھے جو بہت متقی و پرہیزگار تھے اور ہندو بھی انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس لیے اسے بمشکل ہی یقین آتا تھا کہ تمام کے تمام ہندو اسلام کے خلاف کسی بڑی سازش میں

ملوث ہیں۔ اس کی ماں ہر رات اسے قرآن پڑھ کر سناتی اور اس کے بعد نندرشی کی نظمیں سناتی۔ یہ نظمیں سب سے محبت اور سب کی پریشانیوں پر دکھ کا اظہار ہوتی تھیں۔ ان میں کسی خاص ذات یا عقیدے کی تخصیص نہیں ہوتی تھی۔ حمید نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ نندرشی کے اسلام اور پاکستانی مذہبی رہنماؤں کے اسلام کے مابین کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے جس کا وہ جوش وخروش سے تذکرہ کرتے پھر رہے ہیں۔

اس کا کہنا تھا کہ یہ مولوی نہ صرف غیر مسلموں کو ''خدا کے دشمن'' اور ''شیطان کے دوست'' قرار دیتے ہیں بلکہ ان مسلمانوں کو جو ان کے وحشیانہ اسلام سے اتفاق نہیں کرتے، صرف نام کے مسلمان اور تمام عملی مقاصد کے لیے کفار کہتے ہیں۔ اس مولوی نے جو کچھ کہا اس کا روئے سخن صوفی ازم کی طرف تھا جسے اس نے ہندوؤں یہودیوں اور دیگر دشمنانِ اسلام کی تیار کردہ سازش سے تعبیر کیا۔ اس نے کہا کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے مسلح جہاد کے عزم کو سرد کرنے، اسلام کو اندر سے کھوکھلا کرنے اور مسلمانوں کو غلام بنانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اس نے صوفی ازم کو گمراہ کن بدعت اور شرک قرار دیتے ہوئے کہا کہ جو مسلمان صوفیوں کی پیروی کرتے ہیں، جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔ اس نے صاف طور پر اعلان کیا کہ مجاہدین نے جب کشمیر کو بھارت سے آزاد کرالیا تو وہ ایک دوسرا جہاد شروع کریں گے جس کے ذریعے وہ کشمیر کو صوفی ازم کی تمام باقیات سے پاک کر دیں گے۔

صوفیوں کے خلاف تلخ کلامی سن کر حمید کو شدید غصہ آیا۔ بہت سے کشمیری مسلمان صوفیوں کا دلی احترام کرتے ہیں۔ حمید یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ خدا ان نرم دل اور شفیق صوفیا سے محبت کرنے والے کشمیریوں کو جہنم میں بھیج دے گا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ صوفیا ہی تھے جنہوں نے کشمیر میں اسلام پہنچایا۔ یہ لشکر کے مولوی نہیں تھے جنہوں نے لوگوں کے دل جیت کر اس خطے کو اسلام سے روشناس کرایا تھا اور کشمیریوں کے دل اسلام کی محبت، انصاف اور مساوات کے پیغام سے موہ لئے تھے۔ وہ اس تصور سے ہی کانپ اٹھا جب لشکر قسم کے لوگ کشمیر پر قبضہ کر کے صوفیوں کے مزار مسمار کر دیں گے جیسا کہ وہابیوں نے ایک صدی پہلے سعودی عرب میں کیا تھا۔

تین ماہ کی ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد حمید سے کہا گیا کہ وہ لائن آف کنٹرول میں

سے کھسک کر بھارت کے زیر کنٹرول کشمیر میں واپس چلا جائے اور بھارتی مسلح افواج کے خلاف آپریشنز میں شامل ہو جائے۔ تاہم اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور ایک دن چپکے سے کیمپ میں سے نکل کر ایک دور افتادہ قصبے میں چلا گیا۔ اس وقت تک اسے پختہ یقین آچکا تھا کہ بہت سے پاکستانی خود ساختہ مجاہدین کا کشمیری مسلمانوں کی حالت سے کوئی واسطہ نہیں، اس نے بے شمار کہانیاں سُنی تھیں کہ ان میں سے بعض کشمیری عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں اور بے گناہ لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو۔ اس نے پاکستان میں کئی ایسے خود ساختہ جہادیوں کو دیکھا جنہوں نے لوگوں سے جہاد کے نام پر بھاری رقوم حاصل کر کے دولت اکٹھی کی، اس سے اپنے لیے عالیشان بنگلے بنائے ہیں اور اپنے بچوں کو پوش سکولوں میں داخل کرا رکھا ہے جبکہ غریب خاندانوں کو اپنے بچے کشمیر کے قتل گاہوں میں بھیجنے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ بہت سے جہادی درحقیقت محض کرائے کے وحشی قاتل کے سوا کچھ نہیں ہیں اور مختلف گروپوں اور پاکستانی انٹیلی ایجنسیوں سے معاوضے پاتے ہیں۔ اس نے یہاں تک سُن رکھا ہے کہ بعض عسکریت پسند خاص طور پر پنجابی اور پٹھان غیر وہابی خاندانوں کی عورتوں کو غلام بنا کر ان سے جنسی تلذذ حاصل کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے پاکستان میں وسیع پیمانے پر کرپشن ہوتے پائی ہے، یہ اس کے نزدیک مذہبی اور سیاسی اشرافیہ کی منافقت ہے۔ تعلیم کا شعبہ زبوں حالی کا شکار ہے، بنیادی آزادیاں تک مفقود ہیں۔ اس سے اسے یقین آ گیا کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق اس کے ہم وطن لوگوں کے لیے موجب تباہی ہوگا یہ ملک فی الواقعہ ''پاکبازوں'' کا ملک نہیں، جو کچھ اس نے اس سے پہلے اس کے بارے میں تسلیم کر رکھا تھا وہ درست ثابت نہیں ہو سکا۔

حمید اب صرف دو ہزار روپے مہینے پر گزارہ کر رہا ہے جو کوئی نیک شخص اسے باقاعدگی کے ساتھ دے رہا ہے۔ وہ پاکستان سے واپس جانے کے لیے بے تاب ہے وہ دس سال پہلے ایک شب چھپ کر پاکستان میں داخل ہوا تھا۔ والدین کی یاد اسے سخت تڑپا رہی ہے۔ اپنے وطن اور گھر کی ہر چیز اس کو یاد آتی ہے۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا ہے کہ شاید وہ دوبارہ اپنے خاندان کو نہیں دیکھ سکے گا اس سے وہ کانپ اٹھتا ہے سوچتا ہے کہ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اپنے گھر جا کر والدین کی خدمت کرے اور امن وسکون کی زندگی بسر کرے۔ مگر اس کے

واپس جانے کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ وہ وہاں جا کر پاکستانی انٹلی جنس، کسی عسکری تنظیم یا بھارتی فوج کے ہاتھوں ہی مارا جائے۔ پھر اس نے کسی تیسرے ملک چلے جانے کا بھی سوچا ہے تاکہ وہاں سے کچھ کما کر واپس گھر پہنچے اور والدین کی خدمت کر سکے۔ لیکن اس کے پاس سفر کی کوئی قانونی دستاویز یا پاسپورٹ نہیں ہے۔ اگر ایسا کر بھی لے تو کون سا ملک اسے پاکستانی ریفیوجی کے طور پر قبول کرے گا؟ دوسرے ممالک اس کو دہشت گردوں کو پالنے والا ملک کہتے ہیں۔

حمید کو پاکستان کے بارے میں کوئی فریبِ نظر نہیں رہا۔ عسکریت اس گتھی کو سلجھانے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ عسکریت خود کشمیریوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ وہ لکھتا ہے ''اگر وہاں وادی میں صرف ہمارے نوجوان ہی پاکستان کی حقیقت کو جان سکیں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ عسکریت پسندوں کی پشت پناہی کرنا مجرمانہ حماقت ہے۔'' تاہم وہ الزام سے بھارت کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا، وہ لکھتا ہے کہ وہ ان لاکھوں کشمیریوں کو بھول نہیں سکتا جو انڈین آرمی کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ ہندوؤں کی عسکریت پسندی مسئلے کو مزید بے قابو بنا رہی ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کی منظّم خون ریزی کے حالیہ واقعے نے کشمیر میں بھارت مخالف جذبات کو مزید سخت کر دیا ہے۔ وہ یہ تصور کر کے ہی کانپ اٹھتا ہے کہ آئندہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''متعصب ہندو اور انتہا پسند مسلمان بھارت کی سالمیت اور ہندو مسلم صلح و آشتی کے بدترین دشمن ہیں۔'' میں اس سے بمشکل ہی اختلاف کر سکا ہوں۔ یا اس سے بہتر انداز میں بات کر سکتا ہوں۔

حمید کے خط کی آخری سطور یہ ہیں:

پیارے بھائی۔ جس وجہ سے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ دنیا کے جس حصے میں ہم رہ رہے اور بالخصوص کشمیری اپنی زندگی گزار رہے ہیں ہمیں فاشزم کی ساری شکلوں کے خلاف جدوجہد کرنا پڑے گی خواہ یہ شکلیں ہندوؤں کے لباس میں ہوں یا مسلمانوں کے بھیس میں۔ مذہب کے لبادے میں دہشت گردی خدا اور سچے مذہب کی توہین ہے۔ میں نے یہ بات بڑی مشکلیں جھیل کر سیکھی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ میری معروضات کو زیرِغور لائیں گے اور یہ پیغام اپنے دوستوں اور ساری دنیا کو پہنچائیں

گے۔

خدا حافظ اور نمستے

خدا ہماری رہنمائی کرے اور ہمیں ہدایت دے

راہ انسانیت میں آپ کا بھائی

حمید

مجھے خوشگوار حیرت ہو گی اگر یہ آرٹیکل حمید کی نظر سے گزر سکے۔ اگر ایسا ہو تو میں اسے یہ بتانا چاہوں گا ''ٹھیک ہے، حمید بھائی میں وہ کچھ کر رہا ہوں جو آپ نے چاہا ہے''

[17 مارچ 2004]

MashalBooks.org

کشمیر کے سب سے بڑے مدرسے میں

یہ1979 میں قصبہ بانڈی پورہ میں دارالعلوم رحیمیہ کے نام سے قائم ہوا اور یہ جموں اور کشمیر کا سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ اس کی بنیاد مولانا محمد رحمت اللہ نے ڈالی۔ وہ برصغیر کے عظیم ترین مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں، فی الحال اس کے طلبا کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ دیوبند ہی کی روایت کے مطابق یہ ریاست کے چند ایک مدرسوں میں سے ہے جو تخصص کے درجے تک تعلیم دیتے ہیں۔

جو ''ٹرسٹ'' اس مدرسے کو چلاتا ہے وہ اور بھی بہت سے ادارے چلا رہا ہے جو تین الگ الگ کیمپسوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں فیض عام سکول برائے طالبات (سرِ دست پانچویں درجے تک) اور اسی طرح دسویں تک طلبا کا کیمپس بھی شامل ہے۔ ان دونوں اداروں کے لئے نصاب جموں وکشمیر سٹیٹ فار ایجوکیشن کا وضع کیا ہوا ہے اور ساتھ ساتھ طلبا اور طالبات کو مذہبی تعلیم بھی دی جا رہی ہے۔ مدرسہ ایک ایسے الگ پلاٹ پر تعمیر کیا گیا ہے جو ایک متقی و پرہیزگار خاتون عزیز النساء (مرحومہ) نے دیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نیک دل خاتون نے بانڈی پورہ اور اس کے اردگرد کے سینکڑوں لڑکوں اور لڑکیوں کو قرآن مجید پڑھایا تھا۔ مدرسے سے ملحق ایک چارمنزلہ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ہے جس میں مدرسہ کے طلبا کو کمپوٹر، ٹیلرنگ، پینٹنگ، بک بائنڈنگ کی تربیت دی جاتی ہے، اس میں مدرسے سے باہر کے طلبا بھی مختلف ہُنر سیکھ رہے ہیں۔ اس کے قریب ایک مسجد ہے جس میں تقریباً چھ سو افراد بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ایک لائبریری بھی تیزی سے بن رہی ہے جس مین بے شمار کتابیں ہیں اور فارسی اور عربی کے پرانے قلمی نسخے بھی رکھے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دارالعلوم تقریباً ساٹھ جز وقتی مکتب سکول بھی بانڈی پورہ میں اور اردگرد چلا رہا ہے، جن

کے اساتذہ میں بیشتر مدرسے کے سابق سینئر طلبا شامل ہیں۔

مدرسہ کے بزرگوں میں ایک چالیس سالہ مفتی نذیر احمد ہیں وہ فقہ اسلامی میں تخصص کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا اصل کام فتوے دینا ہے ساتھ ساتھ وہ دارالقضاء میں تنازعات کی بھی سماعت کرتے ہیں۔ تادمِ تحریر وہ ہزارہا فتوے جاری کر چکے ہیں۔

جب میں مفتی صاحب سے ملنے ان کے کمرے میں گیا تو وہ ایک کونے میں قالین پر بیٹھے تھے، ان کے اردگرد چند مرد اور خواتین تھیں یہ لوگ اپنے اپنے مسئلوں کا جواب دریافت کرنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک بڑھیا سے کہا کہ وہ اپنا مسئلہ بتائے۔ یہ مسئلہ وراثت یا ازدواجی زندگی کے ان مسائل میں سے تھا جسے مفتی صاحب سے لوگ روزانہ پوچھنے آتے ہیں۔ پھر انہوں نے اس بارے میں دوسرے لوگوں سے پوچھا اور بالآخر بڑھیا کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔

جب یہ مجمع اٹھ کر باہر چلا گیا مفتی نے مجھے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ کا مدرسہ ماڈرن تعلیم کو قبول کرتا ہے جیسی کہ انہی کے قائم کردہ دوسرے سکولوں میں دی جارہی ہے، کشمیری علما کی کمیونٹی کے لیے یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

انہوں نے جواب دیا کہ ''ہرگز نہیں، ہمارے بہت سے علما کا یقین ہے کہ ہمیں ماڈرن اور اسلامی، دونوں قسموں کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ بشمول لڑکیوں کے لیے بھی۔ جو طلبا دونوں قسم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، اپنے الفاظ اور عمل سے موثر طریقے سے اسلام کا اظہار کر سکتے ہیں۔ وہ صرف مذہبی سپیشلسٹ ہی نہیں ہوتے۔ ایک متقی مسلمان انجینئر یا ڈاکٹر اسلام کو انجینئروں اور ڈاکٹروں، دونوں تک بہتر طریقے سے پہنچا سکتا ہے۔ اس سے وہ عام الزام لگنے کی نوبت نہیں آتی کہ مسلم علما دلی طور پر ماڈرن تعلیم خصوصاً مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف ہیں۔

مفتی نذیر احمد نے تعلیم کے اس نقطۂ نظر کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا ''اگر علما جدید قانون کی ڈگریاں حاصل کریں وہ فتویٰ دینے کی بہتر پوزیشن میں ہوں گے۔ یا اگر آپ ایک اقتصادی ادارہ یا ایک نظام کو اسلامی خطوط پر چلانا چاہیں تو علم اقتصادیات میں ڈگری مفید ہوسکتی ہے۔ اگر ایک مدرسے کا گریجویٹ صحافت کی تعلیم حاصل کرتا ہے وہ اسلام کے

صحیح فہم کے ساتھ اپنی فنی مہارت کو بروئے کار لاکر اینٹی مسلم میڈیا پروپیگنڈے کا جواب دے سکتا ہے۔ اس لیے مدرسہ کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو انگریزی اور دوسری زبانوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ جو لوگ اردو نہیں جانتے وہ ان سے بھی بات کر سکیں۔ مفتی صاحب نے مدرسہ کے طالب علموں کے لیے بھی ٹیکنیکل ٹریننگ کو لازمی قرار دیا اور کہا ''یہ ان طلبا کے لیے بہت مفید ہے جو علما کے طور پر اپنا کیریئر نہیں بنانا چاہتے۔''

میں نے مفتی صاحب سے تنازعۂ کشمیر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے شائستگی سے میرے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا ''ہمارا سیاست سے کوئی سروکار نہیں ہے'' تاہم انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ کشمیر میں مدرسوں پر دہشت گردی میں ملوث ہونے یا اسے فروغ دینے کا الزام غلط ہے ''ہم بالکل شفاف اور ایک کھلی کتاب ہیں، اور ہمیں کوئی چیز چھپانے کی ضرورت نہیں۔ ہر کسی کو دعوت ہے کہ وہ ہمارا معائنہ کرے اور ہمارے کلاس رومز میں بیٹھ کر حالات کا جائزہ لے۔ کشمیر میں انٹلی جنس کے ذرائع کسی ایک مدرسے کی بھی نشاندہی نہیں کر سکے کہ ہم اس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ چند ایک گمراہ طلبا کی سرگرمیوں کی بنا پر سب مدرسوں پر دہشت گردی کی فیکٹریوں کی چھاپ لگا دنیا بہت بڑی ناانصافی ہے۔''

مفتی نے مجھے بتایا کہ ''ہم بین المذاہب تعلقات کے بارے میں بات کرتے ہیں اور ان کے بارے میں اسلام جو کچھ بتاتا ہے ہم اس کی بات کرتے ہیں۔ تمام غیر مسلموں کو دشمنانِ اسلام قرار دینا غلط اور غیر اسلامی ہے جیسا کہ بعض حاشیہ بردار لوگ کہتے ہیں۔ کسی مذہب کے ماننے والوں کے بارے میں آپ اس طرح کی تعمیم نہیں کر سکتے۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں اچھے اور بُرے، دونوں قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہوتے ہیں۔ بطور مسلمان ہم دوسروں کے ساتھ اچھے پیرائے میں رابطے قائم کرتے ہیں اور نیک دلی سے انہیں اسلام کے بارے میں اپنی اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں۔''

چنانچہ مفتی صاحب کہتے ہیں کہ امن اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی ایک لازمی چیز ہے کیونکہ اسی کے ذریعے لوگ مسلمانوں کی بات سننے پر آمادہ ہوں گے اور ان کے ایمان اور عقیدے سے آگاہی پائیں گے۔

MashalBooks.org

انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ''ہمیں ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں جاننا چاہیے، دوسروں کی مذمت یا عیب جوئی کے لیے نہیں بلکہ انہیں سمجھنے کے لیے جاننا چاہیے۔'' انہوں نے ایک ہندو کا ذکر کیا جس سے ان کی چند دن پہلے ملاقات ہوئی تھی، اس نے اسلام کے بارے میں پڑھا تھا، جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسلام اخلاقی اقدار پر بہت زور دیتا ہے۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ وہ اسلام کی ان اقدار (values) کی وجہ سے قدر کرتا ہے، نہ کہ مسلمانوں کے رویے کی وجہ سے۔'' بہ الفاظ دیگر اسلام کو بعض مسلمانوں کے بُرے رویے کی بنا پر نہیں جانچنا چاہیے۔

ہماری یہاں تک گفتگو ہوئی تھی کہ مغرب کی اذان ہونے لگی، میں اٹھنے کو تھا کہ انہوں نے مجھے چند کتابیں پکڑا دیں جو اس مدرسے نے شائع کی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اگر میری سرینگر کی بس چھوٹ گئی تو یہاں میں رات بسر کر سکتا ہوں۔ میں ان کی بشاشت، سادگی اور مہمان نوازی سے میں بہت متاثر ہوا تھا لیکن میں نے ان سے جانے کی اجازت لی اور وعدہ کیا کہ میں جلدی واپس آؤں گا اور چند دن یہاں گزاروں گا تا کہ مدرسوں کے اندر کے حالات کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر جان سکوں۔ چند ایک ہی لکھنے والے اس موضوع کی طرف آتے ہیں اور گہرائی میں جا کر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

[15، دسمبر2005]

MashalBooks.org

جماعت سٹائل اسلامی فلسفے کی مفلسی

چند ماہ قبل جب میں جموں میں چھٹیاں منا رہا تھا، اتفاقاً میں ایک مسلم بک شاپ میں جا پہنچا۔ وہاں میری نظر ایک کتاب ''آشوبِ دہر'' پر پڑی (اس ٹائیٹل کا اندازاً ترجمہ ''زمانے کی بپتا'' بنتا ہے)۔ اس کا مصنف قاری سیف الدین ہے جو جماعت اسلامی جموں وکشمیر کا ایک نمایاں ترجمان اور اس کے تاسیسی ارکان میں سے ہے۔

کتاب سیف الدین کے اسلامی جذبے کی عکاس فارسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ چونکہ میں فارسی سے نابلد ہوں، اس لیے میں اس شاعرانہ تخلیق کے معیار پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ خوش قسمتی سے مصنف نے کتاب کا طویل دیباچہ اردو میں لکھا ہے، جسے میں پڑھ سکتا ہوں۔ دیباچے میں جماعت کا تصورِ اسلام بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور غالباً نظموں کے مواد کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔

اسلامیّت کی تمہید اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان ایک فطری اور انمٹ تضاد کے تصور پر رکھی گئی ہے پھر اسلام اور دیگر عقائد کا ایک دائمی اور مخاصمانہ رشتہ قائم کیا گیا ہے جن کے درمیان مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ نتیجتاً اسلام خود کو ہمیشہ چاروں طرف سے دشمنوں کے گھیرے میں پھنسا ہوا پاتا ہے اور ان پر باقاعدہ ''دشمنانِ اسلام'' کی مُہر لگا دی

گئی ہے۔ اس بنا پر وہ خدا کے دشمن بھی قرار پاتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کے بیشتر مسائل کا کُھرا اسلام کے دشمنوں کی سازش کے پردوں کے پیچھے سے ملتا ہے۔ چنانچہ سیف الدین اپنی کتاب کے دیباچے میں یہ کہتے ہوئے بات آگے بڑھاتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام مصائب بشمول مسئلہ جموں وکشمیر کے، غیر مسلموں کی ایک سازش کا حصہ ہیں جو اسلام کو تباہ کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسی سازش ہے جس کی جڑیں ماضیٔ بعید میں ہیں اور یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عالمی سطح کی ہے۔ اس طرح وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صلیبیوں کے محکمہ انٹیلی جنس کا سربراہ ایک جرمن باشندہ ''ہرمن''(Hermann) تھا اس نے بارہویں صدی کے فاتح صلاح الدین ایوبی کو مخاطب کیا جنہوں نے بالآخر صلیبیوں کو مسلم دنیا سے باہر دھکیل دیا تھا۔ خطاب یوں تھا:

> واجب الاحترام سلطان! یہ جنگ جو ہم لڑ رہے ہیں یہ دراصل کلیسا اور کعبے کے مابین جنگ ہے۔ یہ ہمارے مرجانے کے بعد بھی جاری رہے گی۔ ہم اسے میدانِ جنگ میں نہیں لڑیں گے، ہم کسی قلعے کا محاصرہ نہیں کریں گے بلکہ مسلمانوں کے مذہبی عقیدے و ایمان کا محاصرہ کریں گے۔ ہماری بیٹیوں کی دلکشی ، ہماری دولت اور ثقافت کی ترغیبات، جنہیں آپ غیر اخلاقی کہتے ہیں، اسلام کی دیوار میں ایک بڑا شگاف ڈال دیں گی۔ پھر یہ ہوگا کہ مسلمان خود اپنی ثقافت سے نفرت شروع کر دیں گے اور یورپ کے طور طریقوں سے محبت کرنے لگیں گے۔

سیف الدین نے ہرمن اور صلاح الدین ایوبی کی مبینہ ملاقات کو بطور ایک علامت استعمال کیا جو اسلام اور ''غیرِ اسلام'' کے مابین ایک دائمی جنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی ابتلاؤں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کا آغاز مبینہ دشمنِ اسلام منصوبے سے ہوا، جس کے باعث مسلمانوں نے احکاماتِ قرآن اور اسوۂ رسول سے روگردانی شروع کر دی۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دنیا میں خوشحالی اور آخرت میں سرخروئی یہاں اسلامی شریعت کی مکمل پابندی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں۔ سیف الدین نے شریعت

کو ایک مکمل نظام اور احکامات کا کامل مجموعہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دیگر نظامہائے قانون اور معتقدات سے بالکل مختلف اور متفرق ہے۔ دیگر جملہ نظام بالکل باطل، جھوٹے اور شیطانی ہیں۔ انہوں نے دوسرے نظاموں کے خاص خاص اخلاقی اصولوں اور قانونی احکام کے ساتھ اشتراک کے امکانات کو بھی مسترد کر دیا۔

سیف الدین نے شریعت کو ذاتی زندگیوں کا لائحہ عمل بنانے اور معاشرے میں نافذ کرنے کو ہر مسلمان کا فرض قرار دیا۔ وہ اسے ایک مثالی سماجی نظام کو وجود میں لانے کے لیے ایک کلید سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک عالمی مسلم سیاسی برتری کے تصور پر مبنی ہے۔ انہوں نے اپنے قارئین سے یوں اپیل کی:

> کھڑے ہو جاؤ اور اپنے دلوں کو سُستی سے پاک کرو، شمعِ زندگی کو ازسرنو فروزاں کرو۔ اپنی روح کو دوبارہ جگاؤ اور فعّال کر دو، پھر تم دیکھو گے کہ تمہارے دشمنوں کی گردنیں زنجیروں میں ہوں گی۔ کھڑے ہو جاؤ اور دنیا کو مسخر کر لو، جو آج جھوٹ اور دھوکے کی بنیاد پر قائم ہے۔ پھر ایک انصاف پر مبنی دنیا وجود میں لاؤ جو جھوٹ اور دغا بازی کے داغوں سے پاک ہو۔ ایسی دنیا کی تعمیر کرو جو نورِ مصطفیٰ سے جگمگائے۔ ایسی دنیا جس کا حُسن اسوۂ رسول کی اطاعت میں ہو۔ وہ قرآن کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو گی۔ اور پیغمبر کی خوشبوؤں سے معطر ہو گی۔

سیف الدین مزید لکھتے ہیں، ہر مسلمان کو اس تصور پر مبنی نظام کے لیے ناقابل تسخیر جذبے سے کام لینا ہوگا۔ اس کے لیے وہ حالت کا یوں ذکر کرتے ہیں:

> ''پردۂ غیب سے آنے والی ایک آواز نے میرے دل میں چھپے درد کو جگا دیا ہے وہ ایک آتش کدے کی طرح اب پھٹا جا رہا ہے۔ میرے دل میں لگی آگ اتنی شدید ہے کہ اس کے سامنے آگ کے پجاری دریوزہ گروں کے دلوں میں سے اٹھنے والا شعلہ ماند پڑ جاتا ہے۔''

سیف الدین مسلمانوں کے لیے جو معیاری راہِ عمل تجویز کرتے ہیں اسے دیکھ کر

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے لوگ تیار کرنا چاہتے ہیں جو دوسروں پر حکمرانی کریں نہ کہ محکومی پر راضی ہوں۔ یہ مسلمانوں کے اس عمومی اصرار کا مظہر ہے کہ اسلام حکمرانی کرنے کے لیے آیا ہے محکوم بننے کے لیے نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ سیف الدین اور ان جیسے دیگر اسلام پسندوں کے نزدیک یہ امر واقعہ ہے کہ غیر مسلم ممالک میں غیر اسلامی نظاموں کے تحت رہنے والی مسلم اقلیت کے لیے یہ صورت حال بالکل نا قابل برداشت ہے۔ (جیسا کہ کشمیری مسلمان بھارتی حکمرانی کے تحت زندگی گزار رہے ہیں)۔ اس فہم اسلام کے مطابق اسلام اور سیاسی اقتدار کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ ''اسلامی نظام'' حکومت کے لیے مسلسل کوشاں رہیں۔ اس سلسلے میں سیف الدین اپنے قارئین کو خمینی کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے یاد دلاتے ہیں کہ خمینی نے اپنے عوام کو استبداد سے بچایا۔ انہوں نے افغان ''مجاہدین'' کو بھی خراج عقیدت پیش کیا جنہوں نے روسیوں کے خلاف جنگ میں فتح پائی۔ اور کہا کہ یہ فتح اسلام سے ان کی محبت کا نتیجہ تھی۔ سیف الدین نے مزید لکھا کہ افغانوں نے روسیوں کو زندگی کے معنے سمجھائے، جو یہ ہیں کہ ''زندگی کا حُسن خالق کی بندگی میں ہے۔'' انہوں نے لامذہب روسیوں سے کہا کہ وہ راہِ راست پر آجائیں انہوں نے دعویٰ کیا کہ افغان مجاہدین نے اسی راستے پر چلتے ہوئے روسیوں کے دلوں سے جنگ کی گندگی پاک کر دی۔''

سیف الدین نے رائے دی کہ مسلمانوں کے لیے یہ نہایت بیش قیمت سبق ہیں، انہیں یہ یاد رکھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ مسلمانوں کو دنیا کے دیگر حصوں میں ''غلام'' بنائے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اپنے ہم مذہبوں کو خمینی اور افغانوں کا راستہ اپنا کر خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ سیف الدین کا پیغام بنیادی طور پر کشمیریوں کے نام ہے کہ وہ بھارت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ بعض اوقات وہ انقلاب کی صرف انقلاب کے طور پر تحسین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور تحریکوں کو مکمل طور پر غیر ناقدانہ انداز میں لیتے ہیں جن کا دعویٰ تو اسلام نافذ کرنے کا ہے مگر اس کا انجام بے پناہ کشت وخون کی صورت میں نکل رہا ہے جیسا کہ ایران میں اور روسی انخلا کے بعد افغانستان میں ہوا ہے۔

MashalBooks.org

بہت سے دیگر اسلامی خیال پرستوں کی طرح سیف الدین بھی ''اسلامی متبادل'' کی مبہم اصطلاحات استعمال کرتے ہیں اور عملی تفصیلات بتانے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ نفاذِ شریعت کو کشمیریوں کے تمام مسائل کا حل بتاتے ہیں۔ یعنی اگر کشمیری اپنی زندگیوں میں اسلام لائیں اور ایک اسلامی ریاست قائم کریں اور اسلامی نظام نافذ کریں تو ان کے گوناگوں مسائل کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائیں گے، شاید خدا کی مدد سے حل ہو جائیں گے چنانچہ وہ کشمیریوں سے یوں اپیل کرتے ہیں:

> خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط بناؤ تا کہ وہ تم سے خوش ہو جائے رسولِ خدا اور ان کے ہم سفر صحابہ کے راستے کو اپناؤ۔ محبت رسول کو اپنی متاع بناؤ۔ جب تمہارے اندر کی دنیا ایمان کی چنگاری سے جگمگانے لگے گی تو شیطان ملعون راہ فرار اختیار کرے گا۔ اپنے ایمان کی حفاظت کرو خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔ اگر مسلمان متحد ہو گئے تو رسولؐ اللہ کے ارشاد کے مطابق شیطان (جماعت کو دیکھ کر) بھاگ جاتا ہے۔ اگر وہ بالکل ایک ہو گئے تو وہ ایک زبردست قوت کے طور پر ابھریں گے، فتح صرف خدا دیتا ہے، وہ صرف اس کی اطاعت سے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس لیے پیغمبرؐ کو اپنے لیے نمونہ عمل بناؤ۔

میں ایک لمحہ بھر کے لیے بھی مذہبی عقیدے کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا اور سیف الدین کی دردمندانہ اپیل جو انہوں نے خدا پر پورا بھروسہ کرنے کے لیے کی ہے تقریباً سارے مذاہب میں ایک مرکزی مقام رکھتی ہے۔ تاہم جو بات باعثِ تشویش ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں کہاں لکھا ہے کہ اسلام کو ایک مکمل نظام سمجھا جانا چاہیے جبکہ یہ تمام دیگر نظام ہائے عقائد اور نظریات کی مکمل نفی سے شروع ہوتا ہے اور ان سے مکالمے، تعاون اور اشتراکِ عمل کے لیے اپنے اندر کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ یہی کچھ سیف الدین کی کتاب کے دیباچے میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ میں نے اسلام کے علمبرداروں کے نظریات پر مبنی جتنا لٹریچر پڑھا ہے وہ بھی یہی کچھ ہے۔ یہ پریشان کن صورت حال واقعتاً اسلام پسندوں

سے ہی مخصوص نہیں عیسائیوں، یہودیوں اور ہندوؤں کے انتہاپسند اور اختصاص پسند عناصر بھی اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ یہ لوگ تنگ دائروں میں محدود رہتے ہیں نہ خود ان سے باہر آتے ہیں اور نہ کسی دوسرے کو گفتگو کے لیے اندر آنے دیتے ہیں۔ اس لیے بہتر دنیا کی تلاش کے لیے مل جل کر کام کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتے۔

اسی طرح کی پریشانی اس وقت پیش آتی ہے جب لوگ تجربی حقیقت سے مکمل طور پر اندھے بن جاتے ہیں جیسا کہ سیف الدین چھان پھٹک کی زحمت گوارا کئے بغیر خمینی کی حکومت اور روسیوں سے لڑنے والے افغان ''مجاہدین'' کی اندھا دھند تعریف کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ روسیوں کو نکالنے کے بعد انہوں نے آپس میں بے پناہ کشت وخون کیا اور ہزاروں بے گناہ افراد مار دیئے۔ سیف الدین نے کشمیر کے غیر مسلموں سے بالکل کوئی سروکار نہیں رکھا اور انہیں اس قابل نہیں سمجھا کہ اپنی کتاب میں ان کا تذکرہ کرتے۔ وہ بانیٔ جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ کی سفارشات کے مطابق جس قسم کی ریاست قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں اس میں کشمیر کے غیر مسلموں کی حیثیت یا تو ثانوی ہوگی یا اس سے بھی بدتر ہوگی۔ مصنف کتاب کی مبادیات کے منطقی نتیجے کے طور پر اسلام اور دیگر مذاہب کے مابین تعلقات اور متقی مسلمانوں اور ''جھوٹ کے علمبردار'' مسلمانوں کے درمیان تعلقات سخت کشیدہ رہیں گے۔ میں ایک بار پھر اعتراف کرتا ہوں سیف الدین جیسے نظریہ ساز اس معاملے میں بمشکل ہی منفرد ہوں گے۔ ایسے لوگ ہر کہیں پائے جاتے ہیں۔ سادہ حقیقتوں کے بارے میں بھی اندھے پن کا مظاہرہ کرنا، ضدی پن اور بے جالفاظی دیگر مذاہب کے بنیاد پرستوں اور اختصاص پسندوں کو آپس میں ملا دیتی ہے۔ جونہی مذہب آئیڈیالوجی میں تبدیل ہوتا ہے تو اسلام محدود ہوکر طاقتور اور جذباتی نعروں کا ایک مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے، مثلاً اسلام پورا سماجی انصاف دیتا ہے، اسلام تمام مسائل کا حل کرتا اور امن کی ضمانت دیتا ہے، ایسٹ آر ویسٹ اسلام از دی بیسٹ، یہ انتہا پسندوں کے گھڑے ہوئے نعرے ہیں۔ سیف الدین نے اپنی قبیل کے دوسرے لوگوں کی طرح محتاط واقع ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کھوکھلی تعمیمات، گرم گفتار مگر خالی خولی خطابت تک محدود رکھتا ہے۔ وہ پیچیدہ اور حقیقت کی دنیا کے مسائل مثلاً معیاری شہریت کیسی ہوتی ہے اور آئندہ دنیا کے معاملات سے کیسے نمٹا

جائے کے بارے کچھ نہیں کہتا۔ غالباً وہ دنیا کے بارے میں بہت کم جانتا ہے، جیسے کہ بالکل بجا کہا جاتا ہے کہ نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملاّ خطرۂ ایمان یہ محاورہ اس پر ٹھیک بیٹھتا ہے۔

[20، مارچ 2005]

MashalBooks.org

ڈوڈہ میں بین المذاہب تعلقات

ڈوڈہ، مہیب پہاڑوں، سدا بہار گھنے جنگلات اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے دیہات پر مشتمل علاقہ ہے جس میں ہندو اور مسلمان تقریباً نصف نصف تعداد میں رہتے ہیں، میں گزشتہ دو عشروں کے دوران ہر سال اس ضلعے کا سفر کرتا رہا ہوں۔ مسلم عسکریت پسند جماعتیں اور متعصب ہندوؤں کے گروہ یہاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ تاہم ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مضبوط تعلقات ان کو مکمل طور پر دو متحارب فریقوں میں بٹنے سے روکے رکھتے ہیں۔ یہاں کچھ ایسی چیز ہے جس کا میں سال ہا سال سے مطالعہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ عام ہندو اور مسلمان اُن لوگوں سے کس قدر مختلف ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کی طرف سے بول رہے ہیں؟ یہ اُن کو کیسے دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے اُن کا کیسے ذکر کرتے ہیں؟ کون سے مقامی مذہبی ذرائع کو متحرک کر کے فرقہ واریت کی سیاست کو چیلنج کیا جا سکتا ہے جس کے علمبردار مذہب کے نام پر منافرت انگیز زبان استعمال کرتے رہتے ہیں؟

ڈوڈہ میں 1990 کے عشرے کے اوائل میں عسکریت شروع ہوتے ہی ہندو مسلم تعلقات تیزی سے خراب ہونے لگے۔ اس نقطے پر تقریباً سب کا اتفاق ہے۔ بھدرواہ کے قریب کے ایک گاؤں ''ادارانہ'' کے ایک معمر دکاندار مانگٹ نے بتایا کہ یہاں ہندو اور مسلمان اکٹھے رہتے چلے آ رہے ہیں ''ہم ایک دوسرے گھر بمشکل ہی آتے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی دکانوں کی سرپرستی بھی نہیں کرتے۔ البتہ ملاقات ہو جائے تو اچھی طرح ملتے جُلتے ہیں، شادیوں میں بھی ایک دوسرے کو مدعو کر لیتے ہیں، بس بات یہیں تک ہے،

ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت بالکل نہیں رہی۔''

لیکن ایسانہیں ہے کہ ڈوڈہ میں عسکریت شروع ہونے سے پہلے ہندو مسلم تعلقات بہت ہی خوش دلانہ تھے۔ ایک شہری شرما نے بتایا کہ 1947 میں متعدد مسلمان ہندو اور سکھ بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے انہیں مہاراجہ کی فورسز کی حمایت حاصل تھی۔ بھلیسا میں جو کہ ڈوڈہ میں مسلم اکثریت کا گاؤں ہے وہاں چند ہندو مار دیئے گئے تھے۔ شیخ عبداللہ کے دور میں ریاست میں انقلابی زرعی اصلاحات کا نفاذ ہوا تو مزارعین کو جن میں مسلمانوں اور دلتوں کی اکثریت تھی وہ زمینیں مل گئیں جو پہلے راجپوت اور برہمن جاگیرداروں کی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس پر اونچی ذاتوں کو بہت غصہ آیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کے غلبے کو کھوکھلا کیا جارہا ہے۔

شرما نے مزید بتایا کہ 1947 تک ڈوڈہ کے بہت سے مسلمان بے زمین محنت کش تھے اور اس خطے میں مسلم تاجروں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ دلتوں کے ساتھ ساتھ اونچی ذاتوں کے نزدیک وہ بھی اچھوت تھے جاگیردار ان سے ''بیگار'' (جبری و بلااجرت) پر کام کراتے تھے۔1947 میں آنے والی تبدیلیوں کے باعث متوسط تعلیم یافتہ طبقہ ابھر آیا، جس نے روایتی طور پر غالب ہندو طبقے سے سرکاری ملازمتوں اور اقتدار کے لئے بھی مسابقت شروع کر دی جس سے ضلع کی سیاست کی نوعیت تبدیل ہوگئی اور جب سے کشمیر میں عسکریت شروع ہوئی ہے ہندو متعصب گروہ بھی متحرک ہو گئے ہیں اس سے ڈوڈہ میں حالات بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔

ڈوڈہ ٹاؤن کے ایک دکاندار ضیا حسین نے بتایا کہ ڈوڈہ کے بیشتر حصوں میں ہندو اور مسلمان ایک ہی گاؤں میں بطور ہمسایہ رہتے ہیں۔''جس طرح دہلی اور یوپی جیسی جگہوں میں لوگ نسلی اور مذہبی لحاظ سے منقسم آبادیوں میں رہتے ہیں یہاں وہ بات بالکل نہیں ہے''۔ اس نے فخریہ بتایا ''پہلے پہل ڈوڈہ باقی ماندہ ریاست سے دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے الگ تھلگ تھا، اور ہم دوسری جگہوں کے برعکس فرقہ وارانہ جھگڑوں سے محفوظ رہتے تھے لیکن اب سڑکوں کا جال بچھ جانے اور تیز رفتار مواصلاتی سہولتیں زیادہ ہو جانے کی وجہ سے فرقہ پرست قوتیں ہندو اور مسلم دونوں نئے نئے خیالات لے آئے ہیں اور

اب ایسے نظریات جڑیں پکڑ رہے ہیں۔ اگر بھارت کے کسی حصے میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں تو ان کی خبریں فوراً پہنچ جاتی ہیں، ان کی وجہ سے ڈوڈہ میں فضا خراب ہو رہی ہے۔'' اس نے بتایا کہ ''وادیٔ کشمیر میں عسکریت اور بھارت میں مسلمانوں پر جبر وتشدد کی اطلاعات ڈوڈہ میں ہندو مسلم اختلافات میں مزید اضافہ کر رہی ہیں، تاہم مقامی طور پر کوئی بڑے پیمانے کی کشمکش برپا نہیں ہوئی ہے''

مذہب کی چند نئی اشکال جو ریاست کے باہر سے متعارف کرائی جارہی ہیں، ڈوڈہ میں روایتی فرقہ وارانہ مفاہمت کو تباہ کر رہی ہیں۔ ڈوڈہ بھر کے بہت سے مندروں کا کنٹرول اب اتر پردیش اور بہار سے آئے ہوئے پجاریوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان ریاستوں میں وسیع پیمانے پر پائی جانے والی بے روزگاری میں ڈوڈہ کے چند برہمنوں کا بھی دخل ہے جو مندروں میں بطور کیریئر کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان بیرونی ''پجاریوں'' میں سے بہت سے ان ہندو رائٹ ونگ گروپوں کے پُرجوش حامی ہیں جو مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں اور نچلی ذاتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ پیغام بڑی مکاری سے یہاں اپنے پیروکاروں کے ذریعے پہنچاتے ہیں۔ ان چند مقامی ''پجاریوں'' کے برعکس جو مقامی ثقافتی روایات کے اندر اپنی جڑیں رکھتے ہیں اور صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ پُرامن بقائے باہمی کا نتیجہ ہیں کافی حد تک اپنے مسلم ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتے ہیں میں نے نئے ''پجاریوں'' میں سے بہت سوں کے ساتھ مفصل گفتگو کی ہے یہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ معاملات کو مزید خراب کرنے میں ہندوازم کی نئی اشکال مختلف بابوں کے طریقہ ہائے عبادت اور زیادہ اختصاص پسند برہمنی وشنوازم کا بڑا دخل ہے جبکہ اس خطے کی خصوصیت مقامی اور غالباً قبل از آریائی سانپ دیوتا اور شیوا پوجا تھی۔

اس کے متوازی مسلمانوں کے اندر روایتی صوفی پیروں کی روایت کا انحطاط اور اس کے متلازم زیادہ اختصاصی اسلامی (exclusivist Islamic groups) گروپوں از قسم تبلیغی جماعت اور اس سے کسی قدر کم اختصاصی جماعتِ اسلامی کا عروج باعث تشویش ہے۔ یہ دونوں گروپ مقامی مسلمانوں کی ثقافت کے کلیدی پہلوؤں کو غیر اسلامی یا ہندوانہ رسمیں قرار دیتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کے اثرات کی وجہ سے ڈوڈہ کے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے لمبی

داڑھیاں رکھنا اور مونچھیں منڈوانا شروع کر دی ہیں۔ سر پر چھوٹی سی ٹوپی پہنتے ہیں اور شلواریں ٹخنوں سے اوپر رکھتے ہیں۔ یہ دارالعلوم دیوبند کے پیروکاروں سے ملتے جلتے ہیں اور سفر میں رہتے ہوئے اپنا مسلک گھر گھر پہنچاتے ہیں اور عام مسلمانوں سے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔

ڈوڈہ بھر میں اور جموں کشمیر کے دیگر مقامات پر مذہب کو تیزی سے معاشرے کی تقسیم کا ذریعہ بنایا جارہا ہے۔ اس کے لئے ہندو اور مسلم، دونوں گروپ یکساں کوشش کر رہے ہیں لیکن اس امر کے کافی امکانات ہیں کہ مذہب کو حسبِ مراد متضاد مقصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ بھدرواہ سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان طالب علم سجاد نے کہا ''قرآن کہتا ہے کہ خدا نے ہر قوم میں اپنے نبی بھیجے، ہوسکتا ہے کہ ہندوؤں کی بعض مذہبی شخصیات انبیا بھی تھے۔ اسلام ہمیں سبق دیتا ہے کہ ہم ایسے غیر مسلموں کے سامنے محبت اور ہمدردی کے ساتھ اسلام پیش کریں جو ہماری مخالفت نہیں کرتے یا ہمیں دبانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو خودساختہ عسکریت پسند جہاد کے نام پر بے گناہ لوگوں کو قتل کرتے ہیں وہ شیطان کا کام کرتے ہیں، وہ صرف اقتدار یا اپنی ذات کے لیے کر رہے ہیں، خدا کے لیے نہیں کر رہے۔ اس طرح وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ جہاد نہیں کہلا سکتا۔ ان کے ہونٹوں پر تو ''ذکرِ خدا'' ہے لیکن ان کے دل ''فکر خدا'' سے خالی ہیں۔ بعض لوگوں کی یہ سوچ بالکل غلط ہے کہ غیر مسلموں کے خلاف تلوار اٹھانا جہاد ہے۔ اصل میں جہاد یہ ہے کہ کسی نیک کام کے لیے جدوجہد کی جائے اور دوسروں کو اچھائی کی تلقین کی جائے، اگر وہ خدا کی خاطر ہے تو پھر جہاد ہے۔'' اس کے ایک ہندو دوست راجہ نے کہا ''متعصب ہندو بھی مختلف نہیں ہیں، یہ منہ سے رام رام کہنے اور بغل میں چھری رکھنے والے لوگ ہیں۔''

کشتواڑ کے ایک دکاندار عبد الحیّ نے کہا کہ ''ہمارا بطور مسلمان اصل کام دوسروں کو اسلام کے بارے میں بتانا اور محبت کے ساتھ اچھے اعمال کی تبلیغ ہونا چاہیے۔ جب تک ہمیں اپنے مذہب پر آزادانہ عمل کی آزادی ہے اس وقت تک ہم اعلانِ جہاد نہیں کر سکتے۔ ہتھیار اٹھانا جیسا کہ ہم سے بعض لوگ الگ ریاست کے قیام یا کسی دوسری ریاست کے ساتھ الحاق کے لیے کر رہے ہیں، جہاد نہیں کہلا سکتا۔'' اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے

کہا ''لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بھارت میں مسلمانوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور آئین کے آرٹیکل370 کو تباہ کرنے کی کیسی کیسی کوششیں کی جا رہی ہیں (جو کہ جموں وکشمیر کی خصوصی حیثیت کے بارے میں ہے) اور بھارتی مسلح افواج یہاں ڈوڈہ میں اور ہماری ریاست میں دیگر مقامات پر کس طرح قتل و غارت کر رہی ہے، اور ہندوتوا کی قوتیں ہمیں برباد کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، ہم مسلمان جو عسکریت کے شدید مخالف ہیں، قدرتی بات ہے کہ، خوف و ہراس میں مبتلا ہو رہے ہیں۔''

ضلع میں بڑھتی ہوئی مذہبی منافرت کے باوجود ڈوڈہ میں ایسے منظم ''فورمز'' موجود نہیں ہیں جو مکالمہ بین المذاہب کو فروغ دے سکتے ہوں۔ بعض لوگ ڈرتے ہیں کہ وہ امن اور ہم آہنگی کی حمایت میں آواز بلند کرنے پر شاید اپنے ہی ہم مذہبوں کے غصے کا شکار ہو جائیں گے یا عسکریت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گے۔ یا شاید یہ محض بے توجہی ہے۔ جیسا کہ موضع کلہند کے ایک معمر شخص سلیمان کہتے ہیں ''ہوسکتا ہے کہ ہمارے نوجوان بہت زیادہ مادہ پرست اور ایسے سماجی اہمیت کے حامل مسئلے سے لاپرواہ ہو چکے ہیں۔'' لیکن ساتھ ہی گروہی شناختیں تیزی سے ایک دوسری سے دُوری اختیار کر رہی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اب بھی نجی طور پر خیرسگالی تعلقات کی ضرورت پر اصرار کرتی ہے اور اپنے طور پر اس سلسلے میں مقدور بھر سعی کر رہی ہے: وہ سب مل کر ایک دورافتادہ گاؤں میں بے گناہ انسانوں کے قتل عام کی مذمت کرتے ہوئے، برفشار میں پھنسے ہوئے انسانوں یا سڑک کے حادثے کے شکار افراد کو نکالنے کے لئے اپنے وسائل بروئے کار لانے کا عزم رکھتے ہیں یا محض یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ مذہب محبت سکھاتا ہے اور جیسے ایک فرسودہ مقولہ ہے ''خدا ایک ہے'' اور ''ہر کسی کا خون سرخ ہے'' کہہ کر چپ سادھ لیں گے۔

[13، اگست2008]

MashalBooks.org

سیاست اور تبلیغی جماعت: ڈوڈہ کے مناظر

جموں و کشمیر کے صوبہ جموں کا ضلع ڈوڈہ اپنی مذہبی ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ باقی ماندہ ریاست کے برعکس اس ضلعے میں ہندو اور مسلم آبادی تقریباً برابر برابر ہے۔ اس علاقے میں بہت سے مسلمان ان مقامی لوگوں کی اولاد ہیں جنہوں نے اپنا آبائی مذہب تبدیل کر لیا تھا مگر اکثریت کشمیر النسل لوگوں کی ہے، جن کے آباؤ اجداد نے پچھلی تین صدیوں کے دوران قحط، جبری مشقت اور سیاسی استبداد کے ہچکولوں کے باعث وادیٔ کشمیر چھوڑ دی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ڈوڈہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے کسی حد تک ایک مشترکہ ثقافت وضع کر لی تھی تاہم تضادات موجود رہے۔ 1947 تک زیادہ تر مسلمان ہندو راجپوت جاگیرداروں کی زمینوں کی مزارعت کرتے رہے اور بیشتر تاجر اور دکاندار ہندو بنیئے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد ڈوڈہ میں ہندو مسلم تعلقات میں زبردست نشیب و فراز آئے۔ ضلعے کے بعض حصوں میں بالخصوص بھدرواہ اور بھلیسا میں شدید خون ریزی ہوئی جس کی وجہ سے بے شمار لوگ علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ کشتواڑ اور ڈوڈہ کی ''تحصیلیں'' بڑی حد تک پُر امن رہیں۔ شیخ عبداللہ کے زمانے میں ہونے والی زرعی اصلاحات اور تعلیم عامہ کی وجہ سے علاقے کے مسلمانوں اور دلتوں کی اقتصادی حالت کافی حد تک بہتر ہوگئی۔ اس کے ساتھ ساتھ باہر سے آنے والی ہندو اور مسلم احیائی تحریکوں نے، جن میں دائیں بازو اور اختصاصی تحریکوں کے اثرات بھی شامل تھے، مشترکہ مقامی روایات کو متاثر کیا جس کے باعث مذہبی شناختوں کا ازسرِنو تعین ہو گیا۔

ان میں سے ایک احیائی تحریک جو آج ڈوڈہ میں بہت فعال ہے تبلیغی جماعت ہے جو دنیا بھر کی سب سے بڑی اسلامی تحریک ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر دہلی میں ہے، اور اس کا تعلق

دیوبندی مکتبہ فکر سے ہے۔ ان لوگوں کی دعوت یہ ہے کہ مسلمانوں کو ''صحیح'' معنوں میں مسلمان بننے کے لیے اپنی ذاتی زندگیوں میں شریعت (جس کا مفہوم وہ خود ہی جانتے ہیں) کی پابندی کرنی ہوگی۔ انہیں متنازعہ مسائل اور سیاست سے دور رہنا چاہیے اور اپنی آخرت بہتر بنانے کے لیے رسولِ خدا کو اپنے لئے نمونۂ عمل بنانا چاہیے۔ اس کے لیے تبلیغی جماعت کے کارکن گروپوں کی صورت میں جگہ جگہ کا سفر کرتے ہیں اور لوگوں کو اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے مشن میں شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ تبلیغی جماعت کسی بھی دوسری سماجی جماعت کی طرح فوری طور پر کہہ دیتی ہے کہ وہ عملی سیاست سے دور رہتی ہے لیکن اس کے کام کے سیاسی مضمرات واضح طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ ضلع ڈوڈہ میں جاری عسکریت اور غیر حل شدہ تنازعۂ کشمیر کی وجہ سے سیاسی حالات بہت خراب ہو رہے ہیں۔ بہت سے ہندو تبلیغی جماعت کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ تھتھری کا ایک دکاندار رام سنگھ کہتا ہے ''وہ کہتے ہیں کہ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، مگر کون جانتا ہے کہ وہ مسجدوں میں اپنے اجتماعات میں کس چیز کی تبلیغ کرتے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ وہ لوگوں کو مقامی ثقافت ترک کرنے اور صوفیوں کے مزاروں پر جانے سے منع کرتے ہوں کیونکہ ایسا کرنا ان کے نزدک غیر اسلامی ہے، وہ داڑھی رکھنے اور مونچھیں کٹوانے، ٹوپی پہننے اور شلوار کو ٹخنوں سے اونچی رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور اسے سنتِ رسول کہتے ہیں۔ پچاس سال قبل ڈوڈہ میں ہندو اور مسلمان کے درمیان بمشکل ہی کوئی فرق دکھائی دیتا تھا لیکن تبلیغی جماعت کے یہاں آنے کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی ہے، مسلمان واضح طور پر ہندوؤں سے مختلف نظر آتے ہیں۔''

بھدرواہ کے ایک طالب علم نرندر اکمار نے کہا کہ ''ماضی میں یہاں بمشکل ہی کوئی مسجد یا مدرسہ ہوتا تھا، جب سے تبلیغی جماعت کی آمد شروع ہوئی ہے ان دیہات میں مدسوں کے قیام کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے۔ یہاں کے مسلمان مذہب کے بارے میں لاپرواہ تھے اسلام کی بنیادی باتوں سے بھی بے خبر تھے لیکن اب حالات بہت بدل چکے ہیں کیونکہ تبلیغی انہیں بتاتے ہیں کہ ہندو کافر ہیں اور سچا مذہب اسلام ہے۔ کشتواڑ کے ایک قریبی گاؤں کا ایک کسان ہیمنت سنگھ بتاتا ہے کہ ''تبلیغی لیڈر خواہ براہ راست عسکریت نہ پھیلاتے ہوں مگر وہ اسلام کی سخت گیر قسم پھیلا کر ذہنوں کو سخت بنا دیتے ہیں، یہ مسلم شناخت کے ایک اختصاصی مفہوم کی تبلیغ کرتے ہیں ایسی تربیت پانے والے لوگ جوش میں آکر بھارت کے خلاف

لڑنے کے لیے عسکریت پسند بن جاتے ہیں۔

تبلیغی جماعت پر اسی قسم کے الزامات بریلوی لوگ لگاتے ہیں جن کا تعلق صوفیوں کے مزاروں سے ہے۔ تبلیغی اور دیوبندی مکتبۂ فکر، دونوں مزاروں کے خلاف ہیں۔ کشتواڑ کے ایک بریلوی کی تحریروں کا حوالہ دیا جن میں کہا گیا ہے کہ دیوبندی ''اسلام کے دشمن'' ہیں۔ اس نے کہا کہ ''میں نے سنا ہے کہ بعض تبلیغیوں کے دیوبندیوں کی تنظیم حرکت الانصار کے ساتھ رابطے ہیں۔'' اگرچہ اس نے اس الزام کے لیے کوئی شہادت پیش نہیں کی۔

تاہم تبلیغی اس الزام کی تردید کرتے ہیں۔ کشتواڑ کے ایک تبلیغی کارکن محمد حسین نے کہا کہ ''ہم صرف زمین کے نیچے کے انسانی ٹھکانے قبر اور اوپر جنت کی باتیں کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی اور لشکر طیبہ جو اسلامی ریاست کے قیام کے لیے لڑتے ہیں، ہم ان کے برعکس اسلام کی اشاعت کے پُرامن طریقوں سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہمیں سیاسی اقتدار کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے اور شریعہ پر مبنی ریاست کے لیے بھی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایسی ریاست خدا کا ایک عطیہ ہوگی وہ جسے چاہے گا دے دے گا۔ ہمارا کام صرف اپنی ذاتی زندگیوں میں صحیح اسلام لانا ہونا چاہیے۔ جب ایسا ہو جائے گا، خدا ہم سے خوش ہو کر از راہ عنایت ہمیں سیاسی اقتدار دے دے گا۔ لیکن دوسری طرف اگر ہم روزمرہ کی زندگی میں صحیح معنوں میں مسلمان نہیں تو وہ ہمیں کیوں اقتدار دے۔'' اس کے ایک اور ساتھی اللہ بخش نے مجھ سے کہا ''یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم غیر مسلموں کے خلاف نفرت پھیلاتے ہیں، اس کے برعکس ہم مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئیں کیونکہ یہی تو اسلام کا اصرار ہے۔ اگر مسلمان ان کے سامنے اسلام کی اچھی مثال پیش کریں گے تو ان کا دل جیت لیں گے۔ اس طرح اللہ نے چاہا تو وہ خود بخود مسلمان بن جائیں گے۔''

ڈوڈہ کے ایک تبلیغی کارکن شمس الدین نے مجھے بتایا کہ تبلیغی عمومی طور موجودہ عسکریت پسند تحریک میں ملوث نہیں ہوتے ''صرف چند ایک لوگ جنہوں نے جماعت میں تھوڑا سا وقت لگایا ہوتا ہے لیکن اس کو سمجھا نہیں ہوتا شاید وہ عسکری تنظیموں کے ہمدرد بن گئے ہوں گے۔ مگر بطور تحریک ہمارا عسکریت سے کوئی تعلق نہیں۔ عسکریت پسند گروہ کہتے ہیں کہ وہ

اسلام کے لیے لڑ رہے ہیں لیکن بہت سی صورتوں میں وہ دراصل دھن دولت کی حرص اور ہوسِ اقتدار پر پردہ ڈالنے کے لیے ایسے دعوے کرتے ہیں۔ بھارت میں ہمیں پوری مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اس لیے بھارتی ریاست کے خلاف اعلانِ جہاد کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔ کشمیر میں اصل تنازعہ سیاسی ہے مذہبی نہیں ہے جیسا کہ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ ہماری ڈیوٹی یہ ہے کہ ہم غیر مسلموں کو اسلام پہنچائیں، ان کے خلاف نفرت تشدد اور دہشت گردی پھیلا کر انہیں خود سے دور نہ کریں جیسا کہ بعض گروپ سیاسی اقتدار کے لیے کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا ''حکومت جانتی ہے کہ ہم سیاست سے سختی کے ساتھ الگ تھلگ رہتے ہیں ہمارا عسکریت پسندی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا ہیڈکوارٹر انڈیا میں ہے اور ہمیں سارے کشمیر میں آزادی سے اپنی تحریک چلانے کی اجازت ہے۔''

تبلیغیوں نے اعلان کیا کہ سیاست کاری کا کہیں بھی خیر مقدم نہیں کیا جاتا۔ جو گروپ انقلابی سیاست پر اصرار کرتے ہیں کشمیر میں شریعت پر مبنی معاشرے کا قیام انہی کا مطالبہ ہے۔ ڈوڈہ میں لشکر طیبہ سے منسلک ایک پاکستانی مصنف کا شائع کردہ ایک کتابچہ مجھے اتفاقاً مل گیا جس میں تبلیغی جماعت کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر دشمنانِ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں، اس کے لیے اس نے یہ دلیل دی کہ یہ جہاد کی ''غلط تعبیر'' کرتے ہیں۔ ''کفار کے خلاف جہاد کا اعلان کرنے کی بجائے یہ عجیب و مضحکہ خیز اصولوں کا پرچار کرتے پھرتے ہیں۔''

ڈوڈہ میں جماعت اسلامی کے ایک ہمدرد سعد اللہ نے اپنے نظریئے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''مسلمانوں سے یہ کہنا کہ وہ اس دنیا کے بارے میں نہ سوچیں اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کے فریضے سے غافل ہو جائیں، یہ تو مسلمانوں کو سیاست سے الگ تھلگ کر دینے کی کوشش ہے۔'' یہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے، اسلام اپنا ایک سیاسی نظام رکھتا ہے جس کے نفاذ کے لیے کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس نے تبلیغیوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے مصائب پر مسلمانوں ہی کو الزام دینا کہاں کا انصاف ہے، یہ مصائب تو غیر مسلموں کے پیدا کردہ ہیں۔ ''تبلیغی مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان کے تمام مسائل اور ان پر ہونے والا جبر و ستم، ان کی اپنی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے، یہ کسی اور کے استبداد کی وجہ سے نہیں۔ یہ مسلمانوں کو کہتے پھرتے ہیں کہ وہ تبلیغ کے

کام کے لیے سفر کرتے رہیں اور جہاد کو بھول جائیں۔ ایسا کرنا کشمیر میں بھارتی ریاست کے سیاسی مفاد کی خدمت کرنا ہے۔''

اس طرح ڈوڈہ مین تبلیغیوں کے سیاسی کردار کے تصورات شدید طور پر انتشار اور تضاد کے شکار ہیں تاہم ایک نقطہ غیر متنازعہ ہے کہ تبلیغی ڈوڈہ اور دیگر مقامات پر غیر سیاسی رہ کر پیچیدہ سیاسی مضمرات میں لازماً اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

[7، اپریل 2006]

MashalBooks.org

جماعت اسلامی کے اندر سے اٹھنے والی گونا گوں آوازیں

ڈوڈہ کے ایک حالیہ دورے میں، مجھے جماعت اسلامی جموں و کشمیر کے ارکان اور ہمدردوں کے ایک گروپ سے ملاقات کا موقع ملا۔ یہ اسلام پسندوں کی ایک سرکردہ جماعت ہے جو کشمیر کی سیاست میں ایک کلیدی کردار ادا کر رہی ہے۔ میری توقع کے برعکس یہ بیشتر متوسط عمر کے لوئر مڈل طبقہ کے لوگ ہیں اور واضح طور پر اعلیٰ سطح کی رسمی تعلیم تک محدود رسائی رکھتے ہیں۔ بہت مہمان نواز اور دوستانہ مزاج کے حامل ہیں۔ میں نے انہیں اپنے ریسرچ پروجیکٹ کے بارے میں بتایا کہ میں ڈوڈہ میں مختلف طبقوں اور مذاہب کے باہمی تعلقات اور گزشتہ پندرہ سال میں خطے کی صورت حال پر ان کے اثرات کی تحقیق کر رہا ہوں۔ میں نے ان سے ڈوڈہ میں مسلح جدوجہد اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر ان کی رائے پوچھی۔

ان میں سے ایک سینیئر موسٹ شخص جسے میں یہاں صرف ''آر'' (R) کہوں گا، نے بلا توقف کہا کہ دستور جماعت میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ تمام انسان بلا تفریق مذہب اور ذات بندگانِ خدا ہیں۔ اس لیے ہم سب کو اس سے ڈرنا، اس پر ایمان لانا اور اس کے پیغمبروں کے ذریعے موصولہ اس کے احکامات پر عمل کرنا چاہیے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ تمام انسان بطور مخلوق آپس میں بھائی بھائی ہیں، ان سب کے حقوق کا احترام ہونا چاہیے۔'' انہوں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ''دستور جماعت واضح طور پر جائز طریقوں

MashalBooks.org

کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور ایسے تشدد کی ممانعت کرتا ہے جس سے انتشار اور بدامنی پھیلنے کا خطرہ ہو''

میں نے ان کے بیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا، بطور نظریہ آپ نے جو کچھ کہا درست ہے مگر جماعت نے جموں و کشمیر میں ہندو مسلم تعلقات بہتر بنانے کے لیے کیا کیا ہے، کیا یہ درست نہیں ہے کہ جماعت اسلامی نے حزب المجاہدین قائم کر رکھی ہے جو کشمیر میں جاری عسکریت میں کلیدی کردار ادا کر رہی ہے؟ میں نے اس رہنما ''آر'' سے پوچھا کہ یہ اقدام آپ کی جماعت کے اس دعوے سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے کہ جماعت صرف پُرامن طریقوں پر عمل کرنے کا عزم رکھتی ہے؟ میں نے جماعت کے اندرونی حلقوں میں ''ماڈریٹس'' (جو مسئلہ کشمیر کو پُر امن مذاکرات کے ذریعے حل کرانے کے خواہاں ہیں) اور ''ہارڈ لائینرز'' (جس میں سے کچھ حزب المجاہدین کی تخلیق کے ذمہ دار ہیں) کے مابین چھڑی ہوئی بحث کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا ''جی ہاں یہ درست ہے کہ جماعت کے کچھ لوگوں نے حزب المجاہدین کی حمایت کی ہے لیکن امیر جماعت نے اعلان کیا ہے کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'' انہوں نے کہا کہ ''حزب المجاہدین اس وقت قائم ہوئی جب عسکریت ایک لہر کی مانند چل رہی تھی نوجوان اپنے والدین سے اجازت لیے بغیر عسکریت پسند گروہوں میں شامل ہو رہے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ جماعت اسلامی کے بعض کارکنوں کے بچوں نے بھی وہی کچھ کیا ہو، جماعت کے بہت سے رہنما اپنے نوجوانوں کو ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انہیں اس سے روکنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ ہمارا دستور کہتا ہے کہ ہمیں خلفشار اور بدامنی کی مخالفت کرنی چاہیے۔ جماعت اپنے کارکنوں کو کسی خلفشار میں ملوث ہونے سے روکتی ہے۔ انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جماعت کی قیادت کا ایک بااثر حصہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے تشدد کے ذرائع کے استعمال کو فضول قرار دیتا ہے۔

میں نے ''آر'' سے پوچھا کہ کشمیر میں جاری تحریک کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے، کیا آپ اسے ایک مذہبی جنگ یعنی اسلام اور کفر کے درمیان جہاد کہتے ہیں جیسا کہ بعض ''ہارڈ لائیز'' اسلام پسند سمجھتے ہیں، یا یہ محض سیاسی مسئلہ ہے جس کا تعلق کشمیری قوم

پرستوں یا کمیونٹی کی آرزوؤں سے ہے؟

''آر'' نے زور دے کر کہا کہ موجودہ کشمکش کوئی زیادہ مذہبی نہیں بلکہ حقِ سیاسی خودمختاری کے مطالبے کی جنگ ہے، یہ وہ حق ہے جس کا وعدہ تقسیم ہند کے کچھ عرصہ بعد نہرو سمیت کئی بھارتی لیڈروں نے کیا تھا۔ اس نے کہا کہ جہاد ایک محدود مفہوم میں کشمیریوں کی حقِ خودارادیت کی جدوجہد ہے لیکن یہ ایک مذہبی یا اسلامی جہاد نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ بنیادی طور پر ایک نیشنلسٹ تحریک ہے، جو سیاسی ہے مذہبی جدوجہد نہیں ہے۔ اسے مذہبی جہاد کہنا غلط ہے کیونکہ اس کا مقصد دفاعِ ایمان نہیں ہے۔ جہاد کا اعلان صرف اس وقت کیا جا سکتا ہے جب اسلام خطرے میں ہو۔ جب مسلمانوں کو نمازیں پڑھنے اور مسجدیں تعمیر کرنے سے روکا جا رہا ہو۔ تاہم اس نے تسلیم کیا کہ کشمیر میں یا بھارت میں اب تک یہ صورت حال پیدا نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بھارت میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ ہم اپنے جلسے کرنے اور اپنا لٹریچر شائع کرنے میں پوری طرح آزاد ہیں ہم کسی پابندی یا جبر کا سامنا کئے بغیر مذہب کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ آزادی حاصل ہے۔ ہم اپنے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''بعض پاکستانیوں کے کانوں میں یہ بات ڈالی جا رہی ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کو مسجدوں میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں اور یہ کہ انہیں مذہبی آزادی حاصل نہیں لیکن جب وہ یہاں آ کر یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں ایسا ہرگز نہیں تو وہ حیران رہ جاتے ہیں۔''

تاہم اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ کشمیر میں تنازعہ مذہبی نہیں، لیکن اس یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ سرے سے مسئلہ ہی نہیں۔ ''اس کا غیر حل شدہ تنازعہ ہونا ہی ایک کافی حقیقت ہے۔ بھارت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ یہ مسئلہ پچھلی نصف صدی یا اس سے بھی زیادہ عرصہ سے غیر حل شدہ چلا آ رہا ہے اسے صرف مذاکرات سے حل کیا جا سکتا ہے تشدد سے نہیں۔ اسے تینوں فریقوں بھارت، پاکستان اور جموں و کشمیر کے عوام کے اطمینان کے مطابق حل ہونا چاہیے۔

مجلس میں موجود ایک سب سے کم عمر دکھائی دینے والے نوجوان ''جی'' (G) نے کہا

کہ جماعت اسلامی تنازعۂ کشمیر کو پُر امن ذرائع سے حل کرانے کے موقف پر قائم ہے۔ حتیٰ کہ ''اسلامی ریاست'' کا قیام جو جماعت اسلامی کی آئیڈیالوجی میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور عام اسلام پسندوں کے نزدیک بھی اس کی اتنی ہی اہمیت ہے، اس کے لیے پُر امن طریقے استعمال ہوں گے۔ میں نے توجہ دلائی کہ مختلف ممالک میں جتنے انقلابات کے لیے قوت استعمال ہوئی وہ سب ناکام ہو گئے کیونکہ ان میں سماجی انصاف کے نام پر مخالفت میں اٹھنے والی آوازوں کو جبراً دبا دیا گیا تھا۔ روس، چین، افغانستان، ایران اور جہاں جہاں بھی ایسا ہوا، سب کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

''جی'' نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا ''لوگوں سے جو چیز جبراً منوائی جائے، اس سے ان کا دل جلدی بھر جاتا ہے، ہم جس اسلامی ریاست کا قیام چاہتے ہیں وہ لوگوں کی خواہش کے علی الرغم قائم نہیں ہوگی، جو لوگ جبر کرنا چاہتے ہیں وہ یقیناً ناکام ہوں گے ہم پُر امن تبلیغ کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ لوگ خوف سے ہمارے ہمنوا بنیں، ہم ان کی خوش دلانہ خواہش کے مطابق، اسلامی نظامِ حیات کے قیام کے متمنی ہیں۔''

میں نے پوچھا پھر جموں وکشمیر میں غیر مسلموں کی کافی تعداد کا کیا بنے گا۔ وہ یہاں خوش دلی سے اسلامی نظام کے قیام پر کیسے راضی ہوں گے؟ کیا اس کے نتیجے میں غیر مسلموں کا وسیع پیمانے پر انخلا لازمی نہیں ہو جائے گا جیسا کہ ریاست کے ان حصوں میں ہوا ہے جو پاکستان کی حکومت کے ماتحت ہیں؟

اس نے میرے سوال پر کچھ دیر سوچا اور پھر بہ آوازِ بلند بولا ''اسلام غیر مسلموں کو مذہبی آزادی دیتا ہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہوتا تو ہندوستان میں مسلم اقتدار کی اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود یہاں ہندو اتنی اکثریت سے موجود نہ ہوتے ہم جس اسلامی ریاست کے متمنی ہیں اقلیتوں کے حقوق اتنے محفوظ ہوں گے کہ وہ یہاں سے فرار ہونا تو کجا، دنیا بھر کے غیر مسلم یہاں آ جمع ہوں گے۔'' اس نے مزید دلائل دیتے ہوئے کہا کہ مسلم حکمران اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آتے تھے، اس سلسلے میں اس نے تاریخ کا ایک ایسا رُخ پیش کیا جو بالکل

یکطرفہ تھا، ایسا لگتا تھا کہ وہ دل و جان سے ''اسلامی ریاست'' کے مثالی طرزِ عمل پر فدا ہو رہا ہے اور اسے یقین ہے کہ اس کے حکمران اپنے نیک پیشرؤں کے راستے پر چلیں گے۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ''ٹھیک ہے مگر ایسا تبھی ہوگا کہ جس ریاست کو آپ قائم کرنے جا رہے ہیں اس کے قائدین واقعی منصف مزاج اور متقی و پرہیزگار ہوں۔ مگر تلخ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں ایسا ہوسکنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔''

''جی'' اس نے بعجلت جواب دیتے ہوئے کہا ''جب تک ایسے لوگ دستیاب نہیں ہوتے ہم اسلامی نظام نافذ کرنے کی بات ہی نہیں کریں گے۔'' اس نے اعتراف کیا کہ اگر ایسے لوگ دستیاب نہ ہوئے تو ''اسلامی نظام'' کبھی وجود میں نہیں آسکے گا۔

ہماری گفتگو ایک بار گھوم کر ڈوڈہ میں ہندو مسلم تعلقات کے سوال پر آ گئی جو میرے ''ریسرچ پروجیکٹ'' کا موضوع تھا۔ میں نے چند ہارڈ لائینر اسلام پسند گروپوں کا حوالہ دیا جن کے اصل اڈے پاکستان میں ہیں اور وہ جموں اور کشمیر میں سرگرمی دکھا رہے ہیں۔ وہ تمام ہندوؤں کو ''دشمن'' سمجھتے ہوئے انہیں اسلام کے خلاف ''سازشوں'' میں مصروف ظاہر کر رہا تھا۔

''آر'' نے جواب دیتے ہوئے کہا ''اس سوچ کی اسلام میں ہرگز اجازت نہیں ہے، جو لوگ کہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان باہمی یگانگت سے اکٹھے نہیں رہ سکتے، اسلام کی غلط تعبیر کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بھی بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا کہ مسلمان کے بنیادی کاموں میں ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کریں یہ تبھی ہوگا جب وہ ان سے ہمدردی کریں اور ان سے حسنِ اخلاق سے پیش آئیں، نفرت پھیلا کر تو تبلیغ اسلام نہیں کی جا سکتی۔ ''جو لوگ اسلام کے نام پر بے گناہ غیر مسلموں پر حملے کرتے ہیں، وہ ان کے دل و دماغ میں اسلام کے خلاف نفرت پیدا کرتے ہیں۔ اس سے ہمارے بنیادی فرضِ تبلیغ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ہمیں لوگوں کو بتانا ہے کہ اسلام انصاف پھیلانے آیا ہے، نفرت پھیلانے نہیں آیا۔'' اس نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ''ہم اپنی جماعت میں تمام ہندوؤں یا ان میں سے زیادہ تر کو اسلام کے ازلی دشمن نہیں

سمجھتے، جن لوگوں کی یہ رائے ہے وہ غلط ہیں ان کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔ ہم اپنی پالیسیاں صرف اپنے کارکنوں پر نافذ کر سکتے ہیں، ان دوسرے گروپوں سے نہیں منوا سکتے جو اپنی غلط رائے کے اسلامی ہونے پر وہ کتنا ہی اصرار کر رہے ہوں۔''

''آر'' نے کہا کہ جو تنظیمیں اسلام کی ترجمان بننے کا دعویٰ رکھتے ہوئے دہشت پھیلاتی ہیں اور ہندوؤں کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہیں جاہل ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ عملی جہاد بشمول بے گناہوں کے قتل کے، ان ملکوں میں بھی ہوسکتا ہے جہاں مسلمانوں کو مذہبی آزادیاں تو حاصل ہیں مگر اسلامی قوانین نافذ نہیں، تاوقتیکہ وہاں اسلامی نظام قائم ہو جائے۔ اس نے کہا کہ یہ اسلام اصولوں کی بالکل غلط تعبیر ہے۔ خواہ جان بوجھ کر کی جا رہی ہے یا کسی اور وجہ سے۔ ''آر'' نے کہا کہ ''جہاد'' خدا کی راہ میں جدوجہد کے مفہوم میں لازماً پُرامن ذرائع سے ہونا چاہیے مثلاً لوگوں کو ''اسلامی متبادل'' کی ترغیب دینا، جلسے منعقد کرنا اورلٹریچر پھیلانا وغیرہ، جو کہ جماعت اسلامی کی سرکاری پالیسی ہے۔

''آر'' نے جماعت کے دفاع میں جو کچھ کہا مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں تھا۔ میں نے اس سے اس کشمیری اسلام پسند کے بارے میں پوچھا جس کا اصرار تھا کہ مسلمانوں کا ہندوؤں کی اکثریت کے معاشرے میں رہنا بالکل ناممکن ہے اور اس نے اس صورتِ حال کو ''صحرا میں مچھلی کی مثال دے کر بیان کیا تھا، اور اس دلیل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں اسلامی زندگی گزارنے کے لیے دوسروں سے الگ ہو کر رہنا چاہیے۔

اس نے اسے بھی غیر اسلامی تصور قرار دیتے ہوئے کہا کہ عظیم صوفی بزرگ خواجہ معین الدین چشتی راجستھان میں اس وقت آ کر آباد ہوئے تھے جب وہاں مشکل ہی سے کوئی مسلمان رہتا تھا۔ انہوں نے مقامی ہندوؤں کے دل جیتے اور وہ اب بھی ان سے اظہار عقیدت کے لیے ان کے مزار پر جاتے ہیں اور ان کی روح کو ثواب پہنچاتے ہیں، اس نے کہا کہ کوئی جہاں بھی رہتا ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا (ایک مسلمان ملک میں یا ایک ہندو اکثریت کے ملک میں بطور اقلیت رہنے سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا)۔ جب تک مسلمان ایمان کی تبلیغ کر سکتے ہوں اور اس پر عمل کر سکتے ہوں۔ ان کا اصل نام ''دعوت'' یعنی لوگوں

کو اسلام کی طرف بلاتا رہے گا۔

ظاہر ہے کہ میں نے جملہ معترضہ کے طور پر کہا جموں وکشمیر میں پچھلے پندرہ سال کے دوران کے ہنگاموں کی وجہ سے جماعت کے دعوتی کام میں بہت رکاوٹیں پڑی ہوں گی۔ ''آر'' نے اظہار تأسف کرتے ہوئے کہا ''ہاں بالکل ٹھیک''۔ ''جی'' نے اسے ٹوکتے ہوئے مجھے بتایا کہ حکومتِ بھارت نے کشمیر میں جماعت اسلامی پر پابندی لگائی (جو صرف چند سال قبل اٹھائی گئی) بھارتی افواج اور حریف کشمیری مسلح گروپوں نے جماعت کے بہت سے کارکنوں، اور فعال ہمدردوں کو قتل کیا، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی جذبات ابھارے، بہت سے بے گناہ شہریوں کو بھی قتل کیا، ظاہر ہے کہ اس سے ہمارے تبلیغی کام پر بہت بُرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس نے مزید کہا ''ہم نے اصلاحِ احوال کی کوشش کی، مگر کافی بہتری نہ لا سکے۔ دو سال قبل ہم نے ایک جلسۂ عام منعقد کیا جہاں ہم نے چند ریٹائرڈ ہندو سرکاری ملازمین، کو بھی مدعو کیا اور ان کے سامنے اسلام کے بارے میں تقاریر کیں۔ ہماری تقریریں سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ اگر اسلام یہ ہے تو اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں اور یہ بھی کہا کہ اسلام قیام امن کے لیے بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ہم نے گزشتہ برس بھی ایک کانفرنس منعقد کی اس میں بھی بہت سے ہندوؤں کو مدعو کیا مگر صرف ایک رائٹر شریک ہوا''۔

صاف ظاہر ہے کہ جماعت کے رہنماؤں نے ڈوڈہ کے ہندوؤں کو اپنی تنظیم کے مقاصد کے قائل کرنے کی جو کوششیں کیں، ان میں انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی، اسی طرح یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ان کا بین المذاہب مکالمہ غیر مسلموں کو قائل کرنے میں اس لیے ناکام رہا کہ وہ اس کو اپنے ''اسلامی متبادل'' کی برتری کے دعوے کے ساتھ ''لاینحل طور پر مربوط'' (inextricably linked) سمجھتے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہر مذہب کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا اپنا مذہب ہی سب سے بہتر ہے مگر میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ جماعت نے مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر لانے کے لیے کون سے عملی اقدامات کیے۔ اگر ''آر'' کے کہنے کے مطابق ان کی تنظیم کی یہی سوچ تھی تو مشترکہ مقاصد کے لئے دونوں نے ساتھ مل کر غربت کم کرنے، تعلیم عام کرنے، بڑھتی ہوئے صارفیت

(consumerism) کم کرنے اور ماحولیات کی تباہی روکنے کے لیے جو ڈوڈہ میں پچھلے دو عشروں میں ہوئی، کیا اقدامات کیے؟

''آر'' نے جواب دیا ''اس قسم کا مکالمہ بہت ضروری ہے، ہم اس قسم کا کام بھی کرنا چاہتے ہیں، اگرچہ اب تک ہم نے اس سلسلے میں بہت کم کوشش کی ہے۔ نوجوانوں کو مغربی ثقافت اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اس کا ہدف مسلمان اور ہندو دونوں ہیں اور یہ ہم سب کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ ہندو اور مسلمان لیڈر اس لعنت کے مقابلے کے لیے متحد ہو سکتے ہیں۔ یہ ہندو مسلم چپقلش سے بھی بڑا چیلنج ہے۔

اتنے میں قریبی مسجد سے اذان شروع ہوگئی اور میں رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر جماعت اسلامی کا ایک اور ہمدرد کھڑا تھا جسے میں ''P'' (پی) کہوں گا۔ اس سے مجھے ایک روز قبل متعارف کرایا گیا تھا۔ اس نے مجھے نماز ختم ہونے تک ٹھہرنے کو کہا، پھر میں اس کے ساتھ چائے پینے کے لیے ایک ہوٹل میں چلا گیا۔

''پی'' مجھے خیالات کے لحاظ سے کسی قدر اعتدال پسند لگا جو جماعت کے اندر ایک ایسے گروپ کی نشاندہی کر رہا تھا جسے ہارڈ لائینز عناصر نے میڈیا کے ذریعے آگے بڑھنے سے روک رکھا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کشمیر کے بارے میں پاکستان کے کردار پر کتنی واضح تنقید کرتا ہے، اس گروپ کے برعکس جماعت کے چند ہارڈ لائینز پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی مسلسل حمایت کر رہے ہیں۔

''پی'' نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ بھارت کی طرح پاکستان کو بھی کشمیری عوام کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں، اسے صرف علاقے اور اس کے وسائل سے دلچسپی ہے۔ پاکستان کہتا ہے کہ وہ کشمیر میں جہاد کی حمایت کرتا ہے مگر پاکستان ایک اسلامی ریاست نہیں ہے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک سیکولر ریاست ہے۔ اس میں کوئی سماجی انصاف نہیں جو کہ ایک صحیح اسلامی ریاست کا امتیازی نشان ہوتا ہے۔ بانیانِ پاکستان میں سے بیشتر سیکولرازم کے حامی تھے۔ وہ اپنی ذاتی زندگیوں میں بھی متقی و پرہیزگار لوگ نہیں تھے۔ انہوں نے اسلام کا نعرہ صرف مسلم عوام کو فریب دینے کے لیے لگایا تھا تاکہ ایک ایسی الگ ریاست وجود میں آجائے جس پر وہ حکمرانی کر سکیں۔ اس طرح انہوں نے عوام کو بے وقوف بنایا۔ اسی بنا پر بانیٔ جماعت

اسلامی مولانا مودودی نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ پاکستان کے آج کے حکمران ملک کے بانیوں کی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ یہ امریکہ کے غلام بن چکے ہیں۔ پاکستان میں بے پناہ جہالت، عدم مساوات اور ناانصافی پائی جاتی ہے اگر کشمیر اس میں شامل ہو گیا تو پاکستانی یقیناً ایک سونے کی چڑیا بن جائیں گے۔ اگرچہ اس کا کہنا ہے کہ یہ جماعت اسلامی کا سرکاری موقف نہیں ہے، اس کا ذاتی طور پر خیال ہے کہ کشمیر کے لیے بہترین لائحہ عمل یہ ہوگا کہ وہ بھارت اور پاکستان دونوں سے الگ، یعنی خودمختار رہے۔

ڈوڈہ میں جماعت کے ان فعال عناصر سے ہونے والی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تنظیم کے اندر ''ماڈریٹس'' کی آواز کو نہ صرف ہارڈلائینرز بلکہ ریاست کی طرف سے بھی دبایا جا رہا ہے ان کی کوشش ہے اور یہ ضرورت بھی ہے کہ ان کی بات سُنی جائے۔ جماعت کو کشمیر میں ہنگاموں کے برسوں میں کافی ہزیمت اٹھانا پڑی ہے جو اس کے بہت سے فعال کارکنوں اور ہمدردوں کی موت کی صورت میں، اس کی سرگرمیوں پر سرکاری کنٹرول کی صورت میں، اور اس کی داخلی چپقلشوں کی وجہ سے ہوئی۔ جماعت کے ماڈریٹس اپنا دباؤ کس قدر بڑھا سکتے ہیں، یہ دباؤ تنظیم کے مستقبل پر اور جموں و کشمیر میں اسلام پسند تحریکوں پر کس حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں، اس کا پتہ مستقبل میں چلے گا۔ [مئی جون2006]

MashalBooks.org

ایک مختلف ڈوڈہ

میڈیا آج ڈوڈہ کے متعلق جو بات کرتا ہے اُس میں معصوم شہریوں کے قتل، گاؤں کی عورتوں کی جبری آبروریزی اور قصبہ قصبہ کرفیو کے نفاذ ہی سننے میں آتا ہے۔ کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ تشدد اور خون ریزی کے اس نہ رکنے والے سلسلے کے حقیقی طور پر کون ذمہ دار ہیں جنہوں نے ضلع میں مقیم پانچ لاکھ افراد کی زندگیاں اجیرن کر رکھی ہیں۔ عسکریت پسند اس کے لیے بھارتی فوج کو، بھارتی فوج پاکستانیوں کو، پاکستانی ہندو جنونیوں کو، اور ہندو جنونی اسلامی دہشت گردوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ شاید ہی کوئی مہینہ گزرتا ہو جس میں ڈوڈہ کے پہاڑوں میں کہیں نہ کہیں سے وسیع پیمانے پر کشت وخون کی خبر نہ آتی ہو جس سے شدید خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس وسیع قطعۂ ارضی پر قبضے کے لیے کشت وخون نے، جسے تنازعۂ کشمیر کہا جاتا ہے، بے گناہ لوگوں کو بے یقینی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

میں نے ڈوڈہ کا پہلا دورہ وادیٔ کشمیر میں عسکریت کا لاوا پھٹنے سے پہلے کیا تھا۔ مجھے ایک دوست نے ایک مہینہ بھر اپنے اور اپنے خاندان کے ہمراہ بھدرواہ کے ٹاؤن شپ کے ایک مضافاتی گاؤں ''اُدرانہ'' میں گزارنے کی دعوت دی تھی۔ یہ گاؤں ایک طرف سے کیلاش ہمالیائی سلسلے کی بلند برف پوش چوٹیوں اور دوسری جانب سے گھنے جنگلات کے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے جو وادیٔ کشمیر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ایک کھٹارہ قسم کی سرکاری بس میں سوار ہوا تو اس نے جموں سے ادرانہ تک 200 کلومیٹر کا فاصلہ تقریباً چودہ گھنٹوں میں طے کیا۔ سڑک تنگ اور سنگریزوں سے اٹی ہوئی

تھی جو حالیہ برفشار کی وجہ سے لڑھک کر نیچے آ گئے تھے۔ کوئی سو میٹر نیچے دریا شور مچاتا ہوا میدانوں میں سے اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ دونوں جانب صنوبر کے لامتناہی جنگلوں سے ڈھکے ہوئے مہیب پہاڑ خوف کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ معروف ''پٹنیٹوپ'' ہل سٹیشن سے گزر کر ''بٹوٹ'' ٹاؤن شب آ گیا جہاں ہم لنچ کے لیے رکے، پھر آگے چلے تو دھان کے کھیتوں، سیب اور اخروٹ کے درختوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے گاؤں آ گئے۔ ادرانہ پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھا اور وادی مسجد سے آنے والی درد بھری اذان سے گونج رہی تھی جو اہل ایمان کو نماز مغرب کے لیے بلا رہی تھی۔ مسجد سے اگلی گلی میں سانپ دیوتا کا مندر تھا جہاں سے مصروفیتوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ یہ تین روزہ پٹ میلے کے پہلے دن کی شام تھی۔ یہ ''وسوکی ناگ'' کا سالانہ میلہ تھا جو بھدرواہ کے ناگ کی پوجا کرنے والے ہندوؤں کا سرپرست دیوتا تھا۔

بھدرواہ، جیسا کہ مجھے اپنے اولین دورے کے حوالے سے یاد تھا، وہ امن وسکون کا گہوارہ ہوتا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد کم وبیش برابر تھی۔ جبکہ اردگرد کے دیہات میں وہ مشترک آبادیوں کی صورت میں رہتے تھے۔ بازاروں میں، جنہیں کہ دیہاتی لوگ قصبے کہتے تھے، ہندو اور مسلم کوارٹرز پہلو بہ پہلو موجود تھے۔ دکانوں اور کھوکھوں پر لگے ہوئے بورڈوں پر ''ہندو'' اور ''مسلم'' ٹی سٹالز لکھا ہوتا تھا، کھانے پینے کی جگہوں، ہوٹلوں وغیرہ پر بھی گاہکوں کو مذہب کے حوالے سے ترغیب دی جاتی تھی۔ اس کی وجہ جو مجھے بعد میں معلوم ہوئی یہ تھی کہ مقامی ہندو اور مسلمان، الگ الگ اشیا، الگ الگ طریقے سے کھاتے ہیں، دونوں مذاہب کے لوگ اس پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ ایک بار مجھے اپنے راجپوت میزبانوں کے غصے کا نشانہ بھی بننا پڑا تھا، کیونکہ مجھ سے ان کے مقررہ قواعد کی خلاف ورزی سرزد ہوگئی۔ ہوا یوں کہ میں دو ہفتے پھیکی مسور کی دال اور سبزی کھاتے کھاتے تنگ آ گیا تھا، پھر سڑک کے کنارے ایک مسلمان سٹال سے میں نے دو پلیٹ مصالحہ دار چاول کھا لئے۔ تاہم معلوم ہوتا تھا کہ ہندو اور مسلمان نسبتاً امن سے رہتے تھے، ہر ایک دوسرے کے مزاج کا خیال رکھتا تھا۔ باہمی احترام بہت تھا، باہمی فرق سے لاپرواہی بعض اوقات دوستی کو مزید گہری کر دیتی تھی۔ میرے اپنے میزبان کے کئی گہرے دوست مسلمان تھے، اس کا چچا قصبے

کے ایک دولتمند ترین مسلمان تاجروں میں سے ایک کی دکان کے قریب اپنی دکان چلا رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو شادیوں میں مدعو کرتے اور ان میں مذہب کے فرق کو بڑی احتیاط سے ملحوظ رکھتے۔ مسلمان شادیوں میں ہندو مہمانوں کے کھانے تیار کرنے کے لیے ہندو باورچیوں کی خدمات حاصل کر لی جاتیں۔ اگرچہ ہندوؤں کی شادیوں میں مسلمان لذتِ کام و دہن کی خاطر اس ''تمیز'' سے لاپرواہ ہو جاتے تھے۔ تہوار ہندوؤں اور مسلمانوں کے شیر و شکر ہونے کے خاص مواقع ہوتے تھے، جن میں روز مرہ کی زندگی والے امتیازات ختم ہو جاتے تھے۔

میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس گاؤں کے سالانہ تہوار، ''پٹ میلہ'' کے موقع پر آیا تھا، جب میں پہنچا تو ''وسوکی ناگ'' کے مندر کے باہر ایک بہت بڑا مجمع لگا ہوا تھا۔ ادرانہ سے یہاں تک تنگ پتھریلے راستے کی چڑھائی کے سفر کی وجہ سے میری کمر اکڑ گئی تھی۔

سازندے بانسریاں اور ڈھول ایک مسلسل دھیمے انداز میں بجا رہے تھے۔ جبکہ نوجوان ننگے پاؤں جلتے ہوئے انگاروں بھرے گڑھے پر تیز تیز دوڑ رہے تھے تاکہ ناگ دیوتا جو سانپوں کا ایک غضبناک بادشاہ ہوتا ہے ان سے خوش ہو کر ان کی حاجات پوری کر دے۔ ایک جلوس گلیوں میں سے ہوتا ہوا مندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شرکائے جلوس کے ہاتھوں میں چمکیلے رنگوں والی چھتریاں اور جھنڈے تھے۔ مسلم گجر چرواہوں کا، مہندی سے سرخ کی ہوئی داڑھیوں اور خوب کس کر باندھی ہوئی پگڑیوں والا گروپ، مختلف سٹال سجائے بیٹھا تھا، کہیں تازہ دودھ فروخت کیا جا رہا تھا اور کہیں کوئی بزنس کیا جا رہا تھا۔ کشمیری مسلمان مرد اپنی چھجے دار ٹوپیوں کی وجہ سے بہ آسانی قابل شناخت تھے، جو اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ ان مناظر کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

پٹ میلہ کب اور کیسے شروع ہوا اور اس کی اصل بنیاد کیا ہے، یہ ایک اسرار ہے تاہم ایک مقامی کہانی کے مطابق کئی صدیاں پہلے بھدرواہ پر ایک راجپوت حکمران ہوا کرتا تھا۔ شادی کے کئی سال بعد تک وہ بے اولاد رہا بالآخر اس کو وسوکی ناگ نے جو سانپوں کا بادشاہ تھا، ایک بیٹا عطا کیا۔ وہ جب فوت ہوا تو ''ناگ پال'' نے باپ کے جانشین کے طور پر بھدواہ کا تخت سنبھال لیا، وہ نہایت درجے کا خوفناک راجپوت جنگجو تھا۔ کہا جاتا ہے کہ

ایک بار مغل شہنشاہ اکبر نے اپنے تمام نمک خوار جاگیرداروں کو دہلی دربار میں طلب کیا۔ ناگ پال کو بھی اس کی مرضی کے خلاف مجبور کر کے دربار میں لایا گیا۔ جب دوسرے جاگیردار ایک ایک کر کے فرشی سلام و آداب ادا کر کے گزر گئے، ناگ پال وہیں کھڑا رہا اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ شہنشاہ ناراض ہونے کی بجائے اس کی جرأت سے بے حد متاثر ہوا اور اسے متعدد قیمتی تحائف دیئے جن میں ایک سونے کی اور دوسری چاندی کی چھتری، ڈھول اور زیورات بھی شامل تھے، ناگ پال نے واپس آ کر یہ سب تحفے وسوکی ناگ مندر میں پیش کر دیئے۔ یہ لوگ اپنے بادشاہ اور اس کی بہادری کی یاد تقریباً چار سو برس سے ہر موسم گرما میں بھدرواہ میں مناتے ہیں۔

پچھلی بار یعنی دس سال پہلے جب میں پٹ میلے میں شرکت کے لیے بھدرواہ گیا تہوار کی خوشیوں میں مسلمانوں کی عدم شرکت واضح طور پر محسوس ہوئی تھی۔ ہندو اور مسلمان نوجوانوں میں تازہ تازہ جھڑپیں ہوئی تھیں بازار میں کشیدگی کے اثرات صاف نمایاں تھے گلیوں میں کرخت چہروں والے فوجی گشت کر رہے تھے۔ جن جگہوں پر پہلے سبزیوں اور کھانے پینے کی اشیا کے سٹال ہوا کرتے تھے، اب وہاں بنکر بنے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کی دکانیں پھڑ پھڑاتی زعفرانی جھنڈیوں سے پہچانی جا رہی تھیں۔ جبکہ مسلم آبادیوں اور محلوں کی دیواروں پر فوجی مظالم کی مذمت کے نعرے درج تھے۔ میونسپلٹی ورکرز نے انہیں مٹانے کی کوشش کی مگر پھر بھی دکھائی دے رہے تھے۔

اب سخت کرفیو نافذ تھا، غروب آفتاب کے بعد کوئی شخص بھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے میزبان جو اب میرے غیر مروّجہ طور طریقوں کے عادی ہو چکے تھے، یہ سُن کر بدمزہ ہوئے کہ میں کشمیری قہوے کا ایک کپ پینے کے لیے ایک مسلم ٹی سٹال پر رکا تھا۔ گندے مندے سٹال کے خوش اطوار مالک اسماعیل نے آئے روز کے ''بندھوں'' اور ''ہڑتالوں'' اور فوج اور عسکریت پسندوں کی زیادتیوں کی شکایت کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر شدید مایوسی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ ''پٹ میلہ ایک مسلمان اور ایک ہندو بادشاہ کی دوستی کے طور پر منایا جاتا ہے لیکن ان دنوں اس کی کون پرواہ کرتا ہے؟'' اس نے اپنے مٹی کے حُقے کی نالی کو ہٹاتے اور خوشبودار دھوآں باہر

نکالتے ہوئے کہا۔

ڈوڈہ میں مسلم مزاروں پر بھی ہندوؤں کی حاضری تقریباً مکمل طور پر بند ہو چکی تھی جہاں پہلے پہلے ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ آج صوفیوں کی درگاہوں پر، جو ضلع میں بے ڈھنگے پھیلے ہوئے تقریباً سب دیہات میں پائی جاتی ہیں، ہندو نسبتاً کم دیکھے جاتے ہیں۔ ڈوڈہ کی بے حد مشہور صوفی درگاہ کشتواڑ میں ہے جس کا راستہ بھدرواہ سے گاڑی پر دس گھنٹے میں طے ہوتا ہے، کیونکہ دشوار گزار پہاڑی راستوں، گھاٹیوں اور تنگ دروں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ کشتواڑ کے اندر اور ارد گرد گزشتہ دو دہائیوں کے دوران ہونے والی عسکریت میں سینکڑوں ہندو اور مسلمان مارے جا چکے ہیں جب میں پہلی بار یہاں آیا تھا، یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ زیارت گاہ ہوتی تھی۔ یہ سترھویں صدی کے صوفی حضرت بابا فرید الدین بغدادی کی پیگوڈا طرزِ تعمیر کی درگاہ ہے جہاں لوگ ذات اور عقیدے کی حد بندیوں سے بالاتر حاضری دیتے ہیں۔ یہ بابا، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے پیدل ڈوڈہ میں پہنچے تھے، یہ وہ وقت تھا جب بلند پہاڑی دروں میں گزرنے کا مطلب فوری موت ہوتا تھا۔ بابا کی تعلیمات اور سادہ زندگی سے متاثر ہو کر کشتواڑ کا راجپوت بادشاہ بمعہ اپنی رعایا کے، مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ جن لوگوں نے اپنا دھرم نہیں بدلا تھا وہ بھی انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک کہانی یہ سنائی جاتی ہے کہ بابا کے بیٹوں میں سے ایک بیٹا اپنے ایک ہندو دوست سے کوئی کھیل کھیل رہا تھا کہ اچانک اس کی موت واقع ہوگئی۔ بیٹے نے کراماتی طور پر اسے دوبارہ زندہ کر دیا تاکہ وہ کھیل مکمل ہو سکے۔ جب میں بابا کی درگاہ پر پہنچا تو اس کی ڈھلواں چھت پر پتلے سے مینار کی مرمت ہو رہی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ مرمت ایک مقامی ہندو عقیدتمند کے خرچے سے مکمل ہو رہی ہے۔

جیسی کہ میری شنید ہے آج کشتواڑ ایک خوفناک قصبہ بن گیا ہے۔ دکانیں سرِ شام بند ہو جاتی ہیں اور ایک گھنٹے کے بعد ساری گلیاں سنسان ہو جاتی ہیں۔ وسیع ''چوگان'' جو گھاس کا ایک ہموار میدان ہے، قصبے کے آخری سرے پر ہے اس میں مہینوں کوئی کرکٹ میچ نہیں ہوا۔ مسلم عسکریت پسندوں اور متعصب ہندوؤں کے گروہ قصبے میں اکثر لڑتے رہتے ہیں۔ اس طرح زخمی ہونے والوں کے لیے خون کے عطیات کی بلند آواز اپیلیں بابا کے مزار سے

115

کبھی کبھی آنے والی روح پرور موسیقی میں مخل ہوتی رہتی ہیں۔ غالباً بابا دنیا کی نئی منزل پر اپنی قبر میں تڑپتے رہتے ہیں۔

[26، جنوری2004]

MashalBooks.org

ایک دن ''گنڈوہ'' میں

سانپ کی طرح بل کھاتی پتلی سی سڑک، مٹی کے غبار پیچھے چھوڑ کر، بلند و بالا ڈھلوانوں میں سے گزر رہی تھی۔ اردگرد چھوٹے چھوٹے کچے مکانوں پر مشتمل دیہات تھے، جن میں ٹین کی چھت والی مسجدیں اور ڈبہ نما مندر نمایاں طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ گندم اور سرسوں کے ہرے بھرے کھیت، رنگارنگ پیوندکاری سے آراستہ رضائیوں کی طرح، اس ندی کے دونوں کناروں پر ٹانگیں پھیلائے ہوئے تھے، جو دُور واقع برفپوش چوٹیوں سے ٹھنڈے پانی کو تیزی سے نیچے لے جارہی تھی۔ اس پانی نے اپنے بے پناہ جوش کے ساتھ آگے جا کر دریائے چناب کے پانی میں پہنچ کر دم لینا تھا۔

بچے گھاس کے زردمخروطی گٹھوں سے بچے ہوئے کھیتوں میں کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ مہندی لگی داڑھیوں والے گرم و سرد چشیدہ بکروال، جن کے سروں پر متنوع رنگوں کی پگڑیاں تھیں، گھنے بالوں والی پہاڑی بکریوں کے ریوڑوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ان کے بچے اور عورتیں پیچھے پیچھے ان خچروں کو ہانک رہی تھیں جن پر برتن، بالٹیاں اور بستر وغیرہ لدے ہوئے تھے۔ یہ ایک پُرسکون زندگی کی کامل تصویر تھی۔

تاہم یہ تصویر وحشتناک حد تک مغالطہ انگیز تھی۔ باقیماندہ جموں وکشمیر کے ضلع ڈوڈہ کی تحصیل گنڈوہ بھی پندرہ سال سے زائد عرصہ کی کشمکش کے نتیجے میں تباہ حالی سے بچ نہیں سکی۔ گنڈوہ، ڈوڈہ کے دور افتادہ اور ناقابل رسائی حصوں میں سے ہے اور ہماچل پردیش میں چمبہ کے بارڈر کے ساتھ دوطرفہ جڑا ہوا ہے۔ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے جبکہ ہندو اقلیت کل آبادی کے تیسرے حصے سے زائد ہے۔ تاریخی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں

میں تعلقات کافی حد تک خوشگوار رہے ہیں۔ گنڈوہ کے بہت سے مسلمان مختلف مقامی نسلوں کے ان افراد کی اولاد ہیں جنہوں نے صدیوں پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ اگرچہ ایک خاصی تعداد کشمیری نسل سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ زیادہ تر کیسوں میں مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کو چہرے مہرے سے الگ الگ شناخت کرنا عملاً بہت ناممکن ہے، البتہ لباس کے حوالہ سے مسلمان ممیّز دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد اہل سنت دیوبندی اور تبلیغی جماعت سے متاثر ہے۔ اقتصادی لحاظ سے مسلمان اور ہندو یکساں غربت کے شکار ہیں۔ گنڈوہ، ڈوڈہ کے انتہائی پسماندہ حصوں میں سے ہے۔ بیشتر لوگ مویشی پال کر اور پہاڑوں پر زمین ہموار کر کے اور درمیانی تنگ وادیوں ہل چلا کر روزی کماتے ہیں۔

ہم تقریباً سہ پہر کے وقت ''بھٹیاس'' پہنچے جو ایک چوڑی سڑک کے آر پار قطاروں میں بنے مکانوں اور دکانوں پر مشتمل ہے۔ یہ گنڈوہ قصبے سے کوئی سات کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہم تھکے ماندہ ایک چائے کی دکان میں داخل ہوئے جس کے خوش اخلاق مالک نے جلدی سے ہمارے لئے لذیذ ''رجما'' چاول پکوائے جو اس علاقے کے طعام خانوں میں ایک معیاری کھانے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

ہم ایک ہی میز پر ایک دوست مزاج نوجوان مسلمان کے ساتھ بیٹھ گئے جو ایک قریبی گاؤں کا کاشتکار تھا۔ اس نے اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا ''بہت بُرا زمانہ آ گیا ہے، گزشتہ روز اس علاقے کے ایک گاؤں میں ایک نوجوان کو قتل کر دیا گیا۔'' اس نے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ مقامی ''بی جے پی'' کا ایک سرگرم کارکن کہیں سے آ رہا تھا عسکریت پسندوں کے ایک گروپ نے اس کی گاڑی روک کر اس سے مطالبہ کیا کہ تمہارے ساتھ جو سپیشل پولیس افسر بیٹھا ہے وہ اپنا اسلحہ ان کے حوالے کر دے، پھر وہ اس اسلحہ سمیت بھاگ کر دریا کے اس پار جنگل میں روپوش ہو گئے۔ اس کے جواب میں ''ویلیج ڈیفنس کمیٹی'' (VDC) کے ایک ہندو رکن نے گاؤں میں ایک مسلمان لڑکے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جو کہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا، حالانکہ (بقول اس کے) اس لڑکے کا عسکریت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس پر گاؤں کے مسلمان مشتعل ہو گئے اور انہوں نے رکن ویلیج ڈیفنس کمیٹی کی گرفتاری اور اس کو گورنمنٹ کی طرف سے فراہم کردہ اسلحہ واپس لینے کا مطالبہ کر دیا۔ نتیجتاً

متعدد ہندو خاندان گاؤں سے فرار ہو گئے اور اب گنڈوہ میں انہوں نے کیمپ لگا رکھا ہے۔ اس نے کہا ''گاؤں میں حالات اب بھی خراب ہیں۔'' جب میں نے اس سے کہا کہ کیا ہم وہاں جا کر حالات خود دیکھ سکتے ہیں۔ اس پر وہ ہمیں جلدی سے چھوڑ کر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد ایک ہندو دکاندار ہماری ٹیبل پر آ بیٹھا، اس کا اس سے متعلق بیان بالکل مختلف تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ لڑکا عسکریت پسندوں اور وی لج ڈیفنس کمیٹی کی ٹیم کے مابین ہونے والی فائرنگ میں قتل ہوا تھا، ٹیم نے اسے دانستہ طور پر نہیں مارا تھا۔ اس نے بتایا عسکریت پسندوں کی جوابی کاروائی کے خوف سے متعدد ہندو خاندان گاؤں سے فرار ہو گئے اور انہوں نے گنڈوہ میں پناہ لے رکھی ہے۔

اگرچہ ہم اس کی تصدیق نہیں کر سکتے تھے کہ کس کا دعویٰ صحیح ہے۔ ایک ہی واقعہ کی دو بالکل مختلف روئدادوں نے ہمیں گنڈوہ میں شدید فرقہ وارانہ تقسیم کے قائل کر دیا جو یہاں کئی سال سے جاری چپقلش اور تشدد کا نتیجہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حیرت انگیز امر ہے کہ مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شکوک و شبہات کی دیواریں حائل ہونے کے باوجود دونوں انہی قصبوں اور دیہات میں نسبتاً زیادہ امن سے رہ رہے ہیں۔ کبھی کبھار ہونے والے اکّا دکّا واقعات سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ سویلین آبادی کے قتل کی وارداتیں باہمی اختلافات اور بداعتمادی کو بڑھاتی تو ہیں مگر مصالحت پسند قوتیں اس ایریا میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے رشتوں کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی رہتی ہیں اور ان میں سے ایک صوفی تھا جس سے ملاقات کے لیے ہم ڈوڈہ سے اتنا سفر کر کے آئے تھے اس کا نام حاجی صاحب آف اخیار پور تھا۔

ہم دو گھنٹوں کا پیدل سفر کر کے ایک چھوٹی سی آبادی اخیار پور میں پہنچے جہاں حاجی صاحب کا سادہ سا ''کمرۂ ملاقات'' تھا۔ ہمارے نصف راستے میں دو مقامی مسلم نوجوان ہم سے آ ملے۔ انہوں نے بتایا کہ ہم آپس میں بہترین دوست ہیں لیکن سیاسی طور پر ہمارا بہت اختلاف ہے۔ ان میں سے بڑے کے لہجے میں عسکریت پسندوں کے بارے میں تلخی تھی اور اس کا اصرار تھا کہ بیشتر مقامی مسلمانوں اور ہندوؤں کے احساسات یکساں ہیں، اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے کزن کو عسکریت پسندوں نے اغوا کیا اور بعد میں قتل کر دیا، محض اس

لیے کہ اس نے ان کی طلب کردہ رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ ''پہلے پہلے بہت سے عسکریت پسند محض نظریاتی وجوہ کی بنا پر اس تحریک میں شامل تھے، یہی وجہ تھی کہ انہیں کافی حمایت حاصل تھی لیکن اب بے روزگار اور ان پڑھ نوجوان تحریک میں شامل ہو چکے ہیں، جب وہ گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو بہت طاقتور سمجھنے لگتے ہیں بعض اوقات اپنے ذاتی انتقام یا رقم بٹورنے کے لیے طاقت استعمال کرتے ہیں۔''

اس شخص کے دوست نے اس کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ''اس کی بات مت سنیے'' وہ عسکریت پسندوں اور ان کے موقف کے لیے اپنی حمایت نہ چھپا سکا۔ اس نے کہا کہ ''بھارت میں مسلمانوں پر مسلسل مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، دیکھیں ناں گجرات میں کیا ہوا ہے، ہم ایسے ملک میں رہنا کیسے پسند کر سکتے ہیں جس میں مسلمانوں کے لیے امن کی جگہ نہ ہو؟''

دونوں افراد پہاڑی راستے کے تقریباً نصف تک ہمارے ساتھ رہے پھر چلے گئے۔ میں باقی ماندہ راستہ طے کرتے ہوئے اپنے ذہن میں دونوں کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ پھر میں یہ تصور کرتا رہا اگر ان کی جگہ میں ہوتا تو میں دنیا کو کیسے دیکھتا؟ یہ خیال مجھے بے سکوں کئے جا رہا تھا، چونکہ اس علاقے کا تقریباً ہر آدمی روزانہ اپنی ہمسائیگی میں موت اور تباہی دیکھتا اور سنتا آ رہا ہے۔ تو پھر اس کا ردّعمل اس کے مطابق ہی ہونا چاہیے تھا۔

بالآخر جب ہم اخیار پور پہنچ کر حاجی صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ ایک کونے میں چٹائی پر چند لوگوں کی ایک قطار کے سامنے بیٹھے تھے جو ان کے پاس اپنے ضروری کاموں کے لیے آئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر مسلمان تھے، مگر بعض، جیسا کہ مجھے بعد میں پتہ چلا مقامی ہندو بھی تھے۔ ان میں سے چند ایک پونچھ اور کٹھوعہ جیسے دور دراز علاقے سے آئے تھے۔ یہ امید لے کر آئے تھے کہ ان کی مشکلات کا کوئی کراماتی علاج نکل آئے گا۔ ہر کوئی اپنی باری پر آہستہ آہستہ اپنا مسئلہ بیان کر رہا تھا حاجی صاحب صبر سے اس کی بپتا سن رہے تھے اور بعض اوقات موقع پر حل بھی بتا دیتے تھے۔ جب ان کا آخری ملاقاتی بھی چلا گیا تو ہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں شفقت تھی تاہم وہ غمگین، شریف النفس اور ساتھ ساتھ مضبوط عزم کے مالک بھی تھے۔ ان کے بارے میں

ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہ تقریباً ستّر برس کے ہیں مگر وہ اس سے کم عمر کے معلوم ہوتے تھے۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ حاجی صاحب ایک صوفی ہیں جنہیں بے پناہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان کے عقیدتمندوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ تقریباً چالیس برس تحصیل گنڈوہ کے مختلف سرکاری سکولوں میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے ہیں اور اب علاقے کے بہت سے پرائیویٹ سکولوں کی طرح اپنا ایک پرائیویٹ سکول چلا رہے ہیں۔ ڈودہ کے اس غریب اور نسبتاً ناقابل رسائی حصے میں ان کا تدریسی خدمات انجام دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ ان کا سکول فی الحال دسویں جماعت تک ہے اور جموں و کشمیر بورڈ آف ایجوکیشن کے ساتھ منسلک ہے۔ اس میں اندازاً 1000 طالب علم ہیں جن میں زیادہ تر غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان سے فیس دوسروں کی بہ نسبت کم وصول کی جاتی ہے اور جو بچے بہت ہی غریب خاندانوں میں سے ہیں وہ بالکل فری پڑھتے ہیں۔ اس سکول میں کئی ہندوؤں کے بچے بھی پڑھ رہے ہیں۔ اس کے اساتذہ میں سے تقریباً دسواں حصہ ہندو ہیں اور باقی مسلمان ہیں۔ اس سکول کے علاوہ حاجی صاحب ایک مدرسہ بھی چلا رہے ہیں جس کا نام جامعہ غنیات العلوم ہے۔ اس کے طلبا میں سے پچاس طالب علم علما بننے کی تربیت پا رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر غریب بچے ہیں جن کی تعلیم، کھانا اور رہائش مفت ہے۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہیں بطور عالم و خطیب ملازمت بھی دلا دی جاتی ہے۔

ہماری گفتگو خطّے میں جاری کشمکش کی طرف مڑ گئی، تو حاجی صاحب نے ہمیں یقین دلایا کہ ہندو اور مسلمان اس خطے میں روایتی طور پر اتفاق اور ہم آہنگی کے ساتھ رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ تقسیم ہند کے پُرآشوب دنوں میں پُر امن رہے۔ بے گناہوں کے قتل کے حوالہ سے انہوں نے قرآن مجید کے ارشاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کسی ایک بے گناہ شخص کا قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ جب میں نے عسکریت پسندوں اور بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں قتل کے واقعات، جو کہ کافی تعداد میں ہو چکے ہیں، کا ذکر کیا تو انہوں نے زور دے کر کہا کہ قرآن کے بیان کردہ اصول کا ہر جگہ اطلاق ہوتا ہے۔ ''خدا اس دنیا پر رحم فرمائے'' انہوں نے یہ جملہ میرے اس سوال کے جواب میں غیر واضح انداز میں ادا کیا، جس

میں میں نے مسئلہ کشمیر کے حقیقت پسندانہ حل کے امکان کے بارے میں پوچھا تھا۔

حاجی صاحب نے اصرار کیا کہ ہم رات اس گاؤں ہی میں گزاریں۔ ہم سے ڈوڈہ جانے والی آخری گاڑی چھوٹ گئی تھی اور غروب آفتاب کے بعد مین روڈ پر سفر خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک گھنٹے کے بعد ہم نے خود کو کاٹن کی رضائیوں کی تہوں میں پایا، جبکہ لذیذ کھانا، حاجی صاحب کے سکول کے پرنسپل کے گھر میں کھایا تھا۔ پرنسپل اور ان کا بیٹا حقِ میزبانی ادا کر رہے تھے اس حقیقت کے باوجود کہ ہم مکمل طور پر اجنبی اور بن بلائے مہمان تھے ہم سے ایسا سلوک کیا گیا جیسے ہم ان کے عرصہ سے بچھڑے ہوئے دوست ہوں، ہم رات گئے تک محوِ گفتگو رہے جس کا زیادہ تر موضوع ''جاری کشمکش اور اس کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر اثرات'' تھے، جب ہم سونے کے لیے جانے لگے تو پرنسپل نے اپنا ایک خط پڑھ کر سنایا جو حال ہی میں جموں وکشمیر کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔

خط اس سال کے شروع میں ڈوڈہ کے قریب ایک بستی ''کلہند'' میں دو درجن سے زائد ہندوؤں کے سفاکانہ قتل کے بارے میں تھا، جس پر اس خط کے مطابق اس روز مکمل شٹ ڈاؤن ہڑتال رہی تھی۔ اسی صبح پرنسپل کے پوتے نے جو جموں یونیورسٹی کا طالب علم تھا ایک اہم امتحان میں شرکت کرنا تھی اور اس نے سمجھا تھا کہ بوجہ ہڑتال امتحان ملتوی ہو گیا ہوگا۔ اس نے سہ پہر کو اپنے ایک ہندو دوست کو فون کیا، تو یہ سن کر اس کی سٹی گم ہو گئی کہ امتحان اسی روز ہو رہا ہے، اس دن کوئی گاڑی نہیں چل رہی تھی اور پرنسپل کے پوتے کے پاس یونیورسٹی پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا تاہم اس کے دوست نے جو ایگزامی نیشن ہال میں تھا کمال فیاضی کا مظاہرہ کیا موٹر سائیکل کو بھگاتا ہوا اس کے گھر آیا اور اسے فوراً کمرۂ امتحان میں پہنچا کر دم لیا اور دونوں عین وقت پر اپنا اپنا پرچہ شروع کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

''ہندو مُسلم یکجہتی اور دوستی کی ایسی مثالوں کو پریس کو باقاعدگی سے شائع کرنا چاہیے'' خط میں تاکیداً لکھا گیا تھا۔ اس کا اختتام اس سطر پر ہوا جس میں پرنسپل نے انکشاف کیا کہ انہوں نے وزیر اعلیٰ جموں وکشمیر کو اپیل بھیجی کہ وہ ان کے پوتے کے ہندو دوست کے لیے خصوصی انعام کا اعلان کریں کیونکہ اس نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ایک ماڈل کے طور پر

خدمت انجام دی ہے۔

اگلی صبح بھاری ناشتے کے بعد ہم پہاڑ سے اتر کر مین روڈ پر آئے اور ڈوڈہ قصبے کے لیے واپس روانہ ہوئے تو پرنسپل نے گرم جوشی سے معانقہ کر کے ہمیں الوداع کہی اور میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں مقدور بھر کوشش کر کے خط میں کی گئی نصیحت پر عمل کروں گا اور فرقہ وارانہ حدود سے باہر نکل کر محبت اور دوستی کی اس مثال کو اجاگر کروں گا تا کہ دوسرے لوگ بھی اس کی تقلید کر سکیں اور فائدہ اٹھا سکیں۔

[17، اگست 2006]

MashalBooks.org

کشتواڑ: مایوسی میں امید

جموں و کشمیر کے ضلع ڈوڈہ کا قصبہ کشتواڑ ایک تنگ وادی میں واقع ہے، جو اونچے اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے، یہ پہاڑ ایک طرف وادیٔ کشمیر اور دوسری جانب برف کے باعث اجاڑ لداخ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور بڑی اقلیت ہندو ہیں۔ جیسا کہ ڈوڈہ کے بیشتر دوسرے علاقوں میں ہوا، کشتواڑ 1947 میں تقسیم ہند کے موقع پر ہونے والے کشت وخون سے محفوظ رہا۔ ہر معمر کشتواڑی جس سے میری ملاقات ہوتی ہے یہی بتاتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان دنوں قصبے کو ممکنہ فسادات سے بچانے کے لیے کس طرح مشترکہ گشت کمیٹیاں قائم کر دی تھیں۔ اس کے بعد کے برسوں میں ہندو مسلم تعلقات کافی حد تک خوشگوار رہے لیکن 1989 میں کشمیر میں عسکریت پھوٹنے سے صورت حال تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔ یہ ڈوڈہ میں بی جے پی اور دیگر دائیں بازو کے ہندو گروپوں کی بڑھتی ہوئی تعداد، دہشت گرد تنظیموں کے ہاتھوں ہندوؤں کی ہلاکت اور بھارتی فوج کے ہاتھوں مسلمانوں کو تاک تاک کر قتل کرنے کا نتیجہ تھا۔

آج کشتواڑ میں، باقی ماندہ ڈوڈہ کے بیشتر حصوں کی طرح بین المذاہب تعلقات باہمی چپقلشوں اور شکوک وشبہات سے دوچار ہیں، جبکہ یہ حالات کافی حد تک باہمی تعامل اور ایک دوسرے پر انحصار کے متقاضی ہیں۔ بھارت کے بہت سے حصوں کے برعکس کشتواڑ میں ہندو اور مسلمان بالکل الگ الگ آبادیوں میں نہیں رہ سکتے۔ قصبے کے بازاروں میں ہندوؤں کی دکانیں بھی ہیں اور مسلمانوں کی بھی۔ دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے

MashalBooks.org

درمیان دفاتر، کارخانوں، سکولوں اور عام سماجی سطح کے کاموں میں کافی روابط رہتے ہیں۔ دونوں اپنے قصبے پر لگنے والے فرقہ واریت کے الزامات کی مستعدی سے تردید کرتے ہیں۔ بیشتر ہندو اور مسلمان بلاتامل اصرار کرتے ہیں کہ وہ باہمی اختلافات اور اکثر شدید مخالفانہ سیاسی نظریات رکھنے کے باوجود ''ایک'' ہیں اور یہ کہ وہ غم اور خوشی کے مواقع پر ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ہم ان ''فرقہ پرست عناصر'' کے سخت مخالف ہیں جو ہمارے درمیان رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قصبے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس عمومی اصرار کے باوجود کہ یہاں ''فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' پائی جاتی ہے پچھلے پندرہ برسوں میں جموں و کشمیر میں جاری تشدد کی وجہ سے کھڑی شک و شبہے کی دیواریں کشتواڑ میں مضبوطی سے جمی ہوئی ہیں۔ اس سبب کا ایک حصہ یہ ہے کہ قصبے میں بین المذاہب مکالمے کو فروغ دینے کے لیے کوئی منظم کوشش نہیں ہوئی جیسی کہ باقی ماندہ ڈوڈہ میں ہوئی ہے۔ جب اس کا سبب پوچھا جاتا ہے تو بتایا جاتا ہے کہ ''لوگ اپنی ذات میں مگن''(self-centered) ہو گئے ہیں۔ وہ صرف پیسہ بنا رہے ہیں معاشرے کی کسی کو بھی فکر نہیں ہے۔ دوسری توجیہہ یہ کی جاتی ہے کہ: لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ ''این جی اوز'' کیا ہوتی ہیں، وہ کیا کام کرتی ہیں یا کر سکتی ہیں۔ چند ایک ''این جی اوز'' جو موجود ہیں وہ پیسہ بٹورنے والے منظم گروہ بن چکی ہیں۔ ایک اور آواز جو عموماً سننے میں آتی ہے وہ یہ ہے: ''یہاں معاملات کو اتنا سیاسی رنگ دے دیا گیا ہے کہ بین المذاہب مکالمے کو فروغ دینے کی ہر کوشش، یا کسی بھی قسم کا سماجی کام جو کیا جائے اسے کبھی ایک سیاسی جماعت ہائی جیک کر لیتی ہے کبھی دوسری۔ اس کے نتیجے میں یہ جانبدارانہ اور غیر مؤثر بن جاتا ہے۔'' سب سے زیادہ سنی جانے والی وضاحت یہ ہے: ''یہاں امن اور ہندو مسلم ہم آہنگی کی بات کرنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟ اگر ہم امن کے لیے آواز اٹھاتے ہیں تو عسکریت پسند یا مسلح افواج (دونوں کے اپنے اپنے طریقے ہیں) چپقلش کو برقرار رکھنے میں ہی اپنا فائدہ پاتے ہیں ہو سکتا ہے، وہ ہمارا ہی بہ آسانی خاتمہ کر دیں۔

نتیجتاً کشتواڑ میں، وسیع و عریض ضلع ڈوڈہ کی طرح آج کوئی ایسی تنظیم دکھائی نہیں دیتی جو بین المذاہب مکالمے کو فروغ دے رہی ہو۔ اگرچہ حالیہ تین ہفتوں کے دورے میں،

میں جس جس سے ملا ہوں، ان میں سے ہر ایک نے اس کی اہمیت پر زور دیا ہے، تاہم منظّم کوششوں کے فقدان کی وجہ سے مقامی لوگوں نے اپنی قسم کے مکالمے شروع کر دیئے ہیں جو روایتی تصوراتِ نیکی اور شراکت پر مبنی ہیں۔ اس کی ایک مثال ''فریدیہ چاریٹیبل ٹرسٹ'' (Faridia Charitable Trust) ہے جو اٹھارہویں صدی میں عراق سے کشتواڑ میں آ کر بسنے والے حضرت شاہ فرید الدین بغدادی کے نام پر ہے، ہندو اور مسلمان، دونوں ان کا نام بڑی عقیدت سے لیتے ہیں۔ یہ بالکل غیر فرقہ وارانہ سماجی تنظیم ہے جس میں دونوں بڑے مذاہب کے لوگ شانہ بشانہ کام کر رہے ہیں۔

یہ ٹرسٹ 1998 میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک گروپ نے قائم کیا تھا، اس کے زیادہ تر ملازمین قصبہ کشتواڑ کے سرکاری محکموں میں کام کرتے ہیں۔ ٹرسٹ کی کمیٹی کے ایک رکن رویندر کمار نے بتایا کہ یہ ٹرسٹ 1998 میں ایک خوفناک ٹریفک حادثے کے بعد (جس میں بہت سے لوگ جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور کافی زخمی ہوئے تھے) قائم کیا گیا تھا۔ زخمی ہونے والے اتنے غریب و نادار تھے کہ ان کے پاس اپنے علاج کے اخراجات اٹھانے کی بھی سکت نہیں تھی۔ ٹرسٹ نے نہ صرف سب کا علاج کرایا بلکہ مرنے والوں کے پسماندگان کی بھی مدد کی تھی۔ رویندر کمار نے کہا کہ کشتواڑ اونچے اونچے پہاڑوں کا خطہ ہے اس کی چھوٹی چھوٹی آبادیاں پُر خطر ڈھلوانوں پر بنی ہوئی ہیں اور ٹریفک کے حادثے بکثرت ہوتے رہتے ہیں۔ پوری کشتواڑ تحصیل کے لیے صرف ایک بڑا سرکاری ہسپتال ہے جو کشتواڑ قصبے میں ہے جبکہ ساری تحصیل میں ایک بھی پرائیویٹ ہسپتال نہیں ہے، دور افتادہ دیہات کے غریب لوگ علاج کے لیے سفر کے مہنگے اخراجات بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ زیادہ ''سیریس'' کیس ہوں تو کشتواڑ کے مریضوں اور زخمیوں کو آٹھ میل کی مسافت پر جموں لے جانا پڑتا ہے جو کہ غریب خاندانوں کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ اس صورت میں موت یقینی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم چند مسلمان اور ہندو دوستوں نے مل کر تحصیل کے ناداروں کی مدد کے لیے ایک تنظیم قائم کر دی ہے، اس طرح ایمرجنسی کیسوں کے اخراجات پورے ہو رہے ہیں کیونکہ سرکار کی طرف سے فراہم کردہ علاج انتہائی ناکافی ہے۔

ٹرسٹ کے چیئرمین غلام نبی آہنگر نے اپنی تنظیم کے طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے

بتایا ''ہم اپنے ارکان سے ماہانہ بنیادوں پر عطیات وصول کر کے کشتواڑ کے ہسپتال میں زیر علاج افراد کے لیے دواؤں وغیرہ کی خریداری میں جزوی مدد کرتے ہیں ہمارے ارکان کی تعداد400 ہے جن میں نصف ہندو اور نصف مسلمان ہیں۔ رکن ٹرسٹ مہندر کمار نے بتایا کہ ''ہمارے چندوں سے ہر ماہ دس ہزار روپے جمع ہو جاتے ہیں، یہ چھوٹا سا بجٹ ہے جس سے صرف چند مریضوں کو ہی مدد مل سکتی ہے اور وہ بھی جزوی طور پر۔'' حاجی فاروق احمد جو محکمہ سیاحت میں کام کرتے ہیں اور ٹرسٹ کے رکن بھی ہیں، ہر شام ہسپتال کا چکر لگاتے ہیں اور ان مریضوں کا تعین کرتے ہیں جن کی ٹرسٹ مدد کر سکتا ہے اور ان کی بیمار پُرسی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ''ہسپتال میں روزانہ 500 مریض اور زخمی آتے ہیں، لیکن ہسپتال کے پاس صرف چند درجن افراد کے لیے دوائیں ہوتی ہیں۔ ہمارا ٹرسٹ ہر مہینے صرف تیس یا چالیس مریضوں کی مدد کر سکتا ہے، ہم بڑے دکھ کے ساتھ ان چند مریضوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہاں آنے والے مریض بہت ہی غریب ہوتے ہیں۔''

ٹرسٹ کے تمام ارکان رضا کار ہیں اور ذاتی کام چھوڑ کر صرف حصول ثواب کے لیے وقت دیتے ہیں۔ حاجی کندو کہتا ہے کہ اس کا اجر صرف خدا کے پاس ہے، ٹرسٹ اپنی سرگرمیاں اور دائرہ خدمت وسیع کرنا چاہتا ہے۔ پچھلے سال ہم نے روٹری کلب کے ساتھ مل کر ایک آئی کیمپ لگایا تھا۔ ہم ہندو مسلم دونوں مذاہب کے غریبوں کی مدد کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے خوابوں میں سے ایک خواب ایک ''اولڈ ہوم'' کا قیام اور دور دراز سے آنے والے مریضوں کے لیے ایک ہوسٹل کی تعمیر بھی ہے۔ جہاں ڈاکٹر باقاعدگی سے انہیں دیکھنے آیا کرے گا۔ حاجی کندو ہر شام ہسپتال جاتا ہے اور ایک روز وہ مجھے بھی ساتھ لے گیا اور مختلف مریضوں کا مجھ سے تعارف کروایا۔

ہسپتال میں کم روشنی والے کمرے میں ایک بڑا دلدوز منظر تھا۔ مریض اور ان کے لواحقین بنچوں اور بیڈز پر سمٹے بیٹھے تھے اور ڈاکٹر کے راؤنڈ کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ حیرانی کے عالم میں میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے میں خاموشی سے کندو کے ساتھ ساتھ پھرتا رہا جہاں بھی وہ جاتا تھا۔ اس نے پہلے کانتا دیوی کا حال پوچھا۔ پھر نور محمد کے پاس گیا اور اس کے پاؤں کی تکلیف کے بارے میں استفسار کیا۔ ایک فرشتہ سیرت

حاجی نے کہا ''میں اس کام کی پبلسٹی نہیں چاہتا۔ صرف مخلوق خدا کی خدمت کر رہا ہوں خواہ ان کا مذہب وعقیدہ اور صنف کوئی بھی ہو، آپ اس کی مدد کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہر سچا مذہب یہی تعلیم دیتا ہے کہ جو کچھ کرو اس کے اجر کی امید بندوں سے نہیں، ان کے خالق سے رکھو''

ہسپتال سے باہر نکلتے ہوئے میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک اجاڑ گلی میں ہولیا حاجی صاحب کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ پھر میں نے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا مجھے ان سینکڑوں ہندؤوں مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کا خیال آیا جو یہاں کشتواڑ میں مذہب کے نام پر جھگڑوں میں اپنی قیمتی زندگیاں کھو بیٹھے۔ میرا ذہن اس سے پار وادیٔ کشمیر گجرات اور ایودھیا، عراق اور فلسطین اور پھر صدیوں پیچھے گم شدہ ماضی کی طرف سفر کرنے لگا، جس میں لاکھوں کروڑوں لوگوں نے مذہب، قوم اور ملک کے نام پر جان و مال قربان کر دیئے لیکن ایک لمحے کے بعد میرے ذہن میں حاجی کا مقدس چہرہ ابھرا، جو ایک بار مجھے پھر مجھے دھیمے لفظوں میں بتا رہا تھا کہ سچا مذہب کیا ہوتا ہے اور کیا تقاضے کرتا ہے۔ میں اسی کی روشنی میں نہ صرف تنازعۂ کشمیر کے حل کے بارے میں سوچتا ہوں کہ بلکہ دیگر تنازعوں کے حوالے سے بھی غور کرتا ہوں جو دنیا کے سکون کو درہم برہم کر رہے ہیں جن میں ہر فریق نے مذہب کی آڑ میں کشت وخون کیا۔ پھر مجھے کسی قدر سکون آ گیا کہ شاید لوگ مذہب کے حقیقی معنوں پر غور کر کے اس کی روح کے معنوں کو سمجھیں گے تاہم اس پر صدیاں لگ جائیں گی۔

کشتواڑ کے اس دورے میں میری اور بھی کئی مسحور کن شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں جنہیں میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے طریقے پر نازک فرقہ وارانہ اور معاشرتی ہم آہنگی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر قصبے کی مرکزی جامع مسجد کے ادھیڑ عمر امام فاروق حسن کچلو مجھے بہت یاد آئے جنہوں نے بتایا کہ وہ حال ہی میں کشتواڑ سے ہندؤوں اور مسلمانوں کا ایک گروہ لے کر بھدرواہ گئے تھے وہاں انہوں نے ہندؤوں اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑا طے کرایا تھا۔ وہ ہر جمعے کو اپنی تقریر میں مسلمانوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنے ہمسایوں کے حقوق کا خیال رکھیں خواہ ان کا کوئی بھی مذہب ہو۔

MashalBooks.org

میں اس پُر جوش اور بے حد خوبصورت نوجوان اصغر علی شیخ کو بھی بہت یاد کرتا ہوں، اسے ''بٹا'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ کشتواڑ کا ''رابن ہڈ'' ہے لیکن اب اس نے عسکریت چھوڑ دی ہے۔ وہاں کے آبادکار اس کی بڑی عزت کرتے تھے، انہوں نے اس کو فیاضی سے خاصی رقم دی اور اسے ٹریفک کے حادثات کے زخمیوں پر خرچ کرنے کو کہا، خواہ ان کا کوئی بھی مذہب ہو۔ میں نے اس سے کھانے پینے کے ایک کھوکھے پر اس سے ملاقات کی جہاں وہ اپنے پیروکاروں سے گھرا ہوا کھڑا تھا۔ بتایا گیا کہ وہ لداخ کے راستے میں ''پدھر'' کے پہاڑی مقام پر ہونے والے حادثے کے زخمیوں کی طبی امداد کر کے واپس آیا تھا، یہ تمام کے تمام زخمی جموں کے ہندو تھے، اور یہ یہاں سے ان کے لئے دوائیں انجکشن اور مرہم پٹی کا سامان لے کر گیا تھا۔ اس نے ہلاک ہونے والوں کی میتیں بھی ان کے گھروں کو روانہ کیں۔ یہ کام اس کی زندگی بھر کا مشن ہے۔ اس نے بتایا کہ چند سال قبل اس کی بہن اور بھائی حادثے کے شکار ہو گئے تھے، اس سے متاثر ہو کر اس نے حادثات کے متاثرین کی امداد کو اپنا مشن بنایا ہوا ہے۔

مجھے کشتواڑ میں چیئرمین آف دی گرین ماڈل سکول محمد اسلم اگو بھی بہت یاد آ رہا ہے جو جموں و کشمیر کی تحریک آزادی کے ایک سنیئر لیڈر کا بھائی ہے، اس تحریک کا حریت کانفرنس کے سید علی گیلانی کے گروپ کے ساتھ الحاق ہے۔ اسلم اگو مجھے اپنے سکول میں لے گیا جہاں اس نے مجھے اپنے سکول میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کی روائداد سنائی اور اس کی سی ڈیز کا سیٹ بھی مجھے بطور تحفہ دیا، اس مشاعرے کی غرض وغایت ہندو مسلم اتحاد اور بھارت پاکستان اور کشمیر کی دوستی کو فروغ دینا تھا۔ سکول کے پرنسپل جوگندر بھنڈاری نے احساسِ فخر کے ساتھ مجھے بتایا کہ یہاں ہندو مسلمان، حتیٰ کہ چند بودھسٹ اور سکھ بچے بھی زیرِ تعلیم ہیں اور سب کی مشترکہ کھیلیں اور دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کے بچے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ریلیاں بھی نکالتے ہیں۔ اس کے کزن اور سینئر لوکل بی جے پی لیڈر ستیش بھنڈاری کو چند سال قبل عسکریت پسندوں نے قتل کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں گاؤں میں زبردست فرقہ پرستانہ جھڑپیں ہوئیں، یہ تلخ یادیں بھی اسے مسلمانوں کے سکول کے انتظامات سنبھالنے سے باز نہیں رکھ سکیں۔ اس نے بتایا کہ ''کشتواڑ

میں اس قسم کے اکّا دکّا واقعات ہوتے رہتے ہیں مگر یہ کشتواڑ کی صدیوں پرانی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی روایت کو تباہ نہیں کر سکتے۔ یہاں کے بیشتر ہندو اور مسلمان فرقہ واریت پھیلانے والوں کے سخت مخالف ہیں۔''

مجھے ایک نوجوان اقبال کی پیاری مسکراہٹ بھی بہت زیادہ یاد آتی ہے۔ یہ ضلع ڈوڈہ کے غریب ترین حصے گنڈوہ سے تعلق رکھتا ہے، اس کا ایک رشتہ دار بھارتی فوج یا عسکریت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا، اس کے بعد وہ یہاں ایک ''ڈھابہ'' میں ویٹر کے طور پر ملازمت کرنے لگا۔ وہ اور اس سے ذرا بڑا ایک دلت ''نتھو'' جو ادھم پور سے تعلق رکھتا ہے اتنے گہرے دوست ہیں کہ جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ دونوں بڑے زندہ دل اور دلچسپ نوجوان ہیں اور اپنے پاس معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتے ہیں۔ اس ''ڈھابہ'' میں بہت محنت سے کام کرتے ہیں، میں عموماً اسی ''ڈھابہ'' میں رات کا کھانا کھاتا رہا ہوں۔ یہاں مجھے اور بھی بہت سے دلچسپ لوگ ملے۔ ایک روی کمار اور اس کا دوست فردوس ہے، یہ عسکریت پسندی سے تائب ہو جانے والے ایک شخص کا بیٹا ہے۔ یہ دونوں مل کر بزنس کرتے ہیں۔ کھیم سنگھ ایک ہندو راجپوت تھا جس نے ایک درجن نظمیں حضرت محمدؐ کی تعریف میں لکھی ہیں۔ ایک مسلمان درزی راجو اور اس کا ہندو دوست مدن لال رانا ایک ٹیلی فون بوتھ کا مالک ہے جو ایک مقامی دینی مدرسے میں پہنچانے والا میرا گائیڈ تھا۔

یہ سطور لکھتے ہوئے مجھے کشتواڑ میں سترھویں صدی کے صوفی بزرگ شاہ فرید الدین بغدادی کا وسیع علاقے میں پھیلا ہوا مزار ''آستانۂ بالا'' یاد آرہا ہے جو شہر کے قلب میں چٹان کی چوٹی پر پیگوڈا کی طرح ٹکا ہوا ہے اور برف کے نیچے مستقلاً دفن شدہ عمودی چوٹیوں کے بالکل مقابل ہے۔ یہ چوٹیاں لدّاخ کے یخ بستہ صحراؤں اور ان سے پرے تک رہنمائی کرتی ہیں۔ میں مزار کے باہر ایک دکان سے آنے والے صوفیانہ کلام کا نالہ وشیون سن رہا ہوں جو روح کو بلندیوں کی طرف لے جا کر کیف وسُرور سے سرشار کر دیتا ہے۔ اگرچہ میں اس کے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھ سکتا، میں اس مزار پر کئی دن جاتا رہا اور کئی گھنٹے وہاں گزارے تھے۔

کشتواڑی مذہبی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر مزار کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ بی جے

پی کے متعدد ہندو سپورٹرز بھی اس جگہ مدفون بزرگ کی آشیر باد لینے کے لیے باقاعدگی سے آتے ہیں۔ شاہ فرید الدین بغداد سے پیدل چل کر کشتواڑ کے پہاڑی قلعوں تک پہنچے۔ ان کی محبت اور شفقت کی تعلیمات نے اس وقت کے حکمرانِ قصبہ راجہ کیرت سنگھ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ مسلمان ہو گیا اور اظہار عقیدت کے لیے اپنے لیے ایک منفرد نام ''تیغ محمد سنگھ'' رکھ لیا اور اپنی بیٹی کا رشتہ بھی شاہ فرید الدین کے ایک مرید سید بہاء الدین سمنانی کو دے دیا۔ اس کی رعایا کے بھی کئی لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ جو لوگ اسلام قبول نہ کر سکے اور ہندو ہی رہے وہ بھی شاہ فرید الدین سے اظہار عقیدت کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے ایک مقامی راجپوت عورت سے شادی کی۔ اس کے جنمی خاندان کے لوگ ہندو ہونے کے باوجود اب تک مزار سے متعلقہ رسومات کی ادائیگی میں ایک خاص رول رکھتے ہیں۔

اب میرا ذہن سفر کرتا ہوا شاہ فریدالدین کے صاحبزادے شاہ اسرار الدین کی درگاہ دربار اسراریہ میں جا پہنچا ہے۔ ان کے بچپن کے واقعات میں سے ایک کراماتی واقعہ جو بہت مشہور ہے یہ ہے کہ وہ ایک دن اپنے ایک ہندو دوست کے ساتھ پولو کھیل رہے تھے جس کے دوران اس کی موت واقع ہو گئی۔ انہوں نے اس کو دوبارہ ''زندہ'' کر دیا، تاکہ کھیل مکمل ہو سکے۔ مجھے اس کرامت کے وقوع پر شک ضرور ہے تاہم اس کی سپرٹ کو سمجھا جانا چاہیے۔ میں اپنے تصور میں اس دربار کے متولی ریاض احمد سے مل رہا ہوں جس نے مجھے اپنے قیمتی وقت کا بہت سا حصہ دیا اور کشتواڑ کے صوفیوں کے قصے سنائے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ''اسلام انصاف اور امن کا علمبردار ہے، مسلمانوں کو دوسروں کے ساتھ محبت کے رشتے قائم کرنے چاہئیں خدا سارے جہانوں کا پروردگار ہے صرف مسلمانوں ہی کا نہیں ہے۔ اسی طرح محمد مصطفیٰؐ دنیا میں رحمۃ للعالمین بن کر آئے تھے۔'' اس نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ بعض اسلام پسند لوگ مذہب کی سچائیوں اور انسانی ہمدردی کے جذبوں کو کچل رہے ہیں۔ اسی طرح ان کے ہندو ہمنوا اپنی مذہبی قدروں کی تذلیل کر رہے ہیں۔ ''مذہب نہیں سکھاتا آپ میں بیر رکھنا'' اس نے مجھے علامہ محمد اقبال کے محبت پر مبنی کئی اشعار سنائے اور کشتواڑ اور دیگر مقامات پر عسکریت پسندوں اور بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں بے گناہ شہریوں کے قتل کے واقعات کی شدید مذمت کی۔ میں وہاں کی ان نیک روحوں کے بارے میں سوچتا رہتا

ہوں، اور تمنا کرتا ہوں کہ ان لوگوں سے ایک بار پھر ملاقات کر سکوں۔

[جون2006]

MashalBooks.org

ڈوڈہ کے یتیم: مسلسل کشمکش کے معصوم شکار

ڈوڈہ میں اب تک کتنے بچے یتیم ہو چکے ہیں، ان کی صحیح تعداد کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔ لدّاخ کے بعد ڈوڈہ رقبے کے لحاظ سے جموں وکشمیر کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ پچھلے پندرہ برسوں میں بے پناہ کشت وخون ہوا، جس میں سینکڑوں افراد اپنی جانیں کھو بیٹھے۔ یہ زیادہ تر عسکریت پسندوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے اگرچہ انڈین آرمڈ فورسز کی کاروائیوں سے مرنے والے سویلنز کی تعداد بھی کوئی کم نہیں ہے لہٰذا ڈوڈہ میں ہزاروں بچے اس خطے میں اب تک جاری جھڑپوں میں یتیم ہو چکے ہیں، ان کے باپ، ان کے سہارے اور انہیں روٹی لا کر دینے والے دنیا چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اسی طرح بیواؤں کی بھی ایک خاص تعداد حالات کے رحم و کرم پر زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے بچے بھی ہیں جن کے والدین جموں وکشمیر میں جاری کشمکش کی زد میں نہیں آئے بلکہ دیگر اسباب کی وجہ سے ہلاک ہوئے ہیں۔

ضلع ڈوڈہ میں ''یتیم'' کی اصطلاح اس بچے یا بچی کے لیے استعمال ہوتی ہے جو اپنے والد سے یا خاندان کے لیے روزی کمانے والے سے محروم ہو گیا یا گئی ہو۔ خواہ اس کی والدہ اب بھی زندہ ہو۔ اگرچہ ریاست ایسے یتیموں کے لیے امداد فراہم کرنے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن اگر مسئلے کے حجم کو دیکھا جائے تو ان بچوں کی بہت کم تعداد معقول ریاستی امداد پاتی ہے جس سے وہ زندگی کا بوجھ کچھ ہلکا کر سکتے ہوں۔ پورے ضلع ڈوڈہ اور وادیٔ کشمیر کے جملہ اضلاع کے یتیم بچوں کے لیے سرکار کے زیر انتظام صرف دو درمیانے درجے کے یتیم خانے

ہیں، جن کی حالت دیگر سرکاری اداروں کی طرح بدنظمیوں کی شکار ہے۔ مزید بدقسمتی یہ ہے کہ مقامی معاشرتی تنظیموں نے یتیم بچوں کی حالت سدھارنے کے لیے بہت ہی کم کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت کہ پورے ضلع میں ایک ہی پرائیویٹ یتیم خانہ ہے اور وہ بھی صرف اٹھارہ بچوں کی کفالت کر رہا ہے کسمپرسی کا واضح ثبوت ہے۔ یہ مایوس کن صورت حال ریاست اور مقامی سماجی تنظیموں کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ یہ اس حقیقت کی مظہر بھی ہے کہ ڈوڈہ کے یتیموں کی دیکھ بھال دور پار کے رشتہ دار خاندان کرتے ہیں جو انہیں کسی اور جگہ کے اداروں میں بھیجنے سے گریز کرتے ہیں۔

وادیٔ کشمیر کے برعکس پورے ضلع ڈوڈہ میں کوئی اچھی طرح منظّم اور قابل اعتماد این جی اوز نہیں پائی جاتیں، اس سے اس امر کی تھوڑی بہت وضاحت ہو جاتی ہے کہ خطے میں یتیموں کی خاصی تعداد کی مدد کے لیے کوئی منظّم مساعی نہیں ہو رہیں۔ چند ایک مقامی گروپ یتیم بچوں کی اپنے طور پر دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے بچوں کو سہارا دینے کی کوئی سکیم نہیں ہے۔ نہ ہی ان لوگوں کو اس بات کا پتہ ہے کہ جموں و کشمیر کے باہر دوسری ''این جی اوز'' موجود ہیں جو ان کی مدد کو آسکتی ہیں۔ ان میں سے کسی گروپ کے پاس ہمہ وقتی سٹاف نہیں ہے نہ ہی فعال لوگوں کا انہیں تعاون حاصل ہے۔ ان گروپوں کو صرف بزنس مینوں، سرکاری ملازمین یا ریٹائرڈ افراد کی طرف سے تھوڑی بہت مدد ملتی ہے، یہ لوگ سماجی کاموں کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتے۔

ایسا ایک گروپ ''جموں و کشمیر یتیم فاؤنڈیشن'' ہے۔ یہ قدیم ترین تنظیم ہے جو وادیٔ کشمیر میں متعدد یتیم خانے اور سکول چلا رہی ہے۔ ڈوڈہ میں اس نے چار سال قبل کام شروع کیا تھا مگر اس کی کارکردگی یا کامیابیاں زیادہ نمایاں نہیں۔ یہاں فاؤنڈیشن کے لیے مشتاق فریدی کام کر رہا ہے، اس نے مجھے بتایا کہ ضلع میں سے اس نے صرف چھ یتیم بچوں کو سری نگر میں فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام چلنے والے یتیم خانوں میں بھیجا ہے۔ اگرچہ اس سال ایک بچہ بھی نہیں بھیجا گیا۔ علاوہ ازیں فاؤنڈیشن غریب خاندانوں کے تقریباً نصف درجن بچوں کو دو دو سو روپے مہینہ اور آٹھ بیواؤں کو۔ جن میں ایک ہندو بیوہ بھی شامل ہے، سات سات سو روپے وظیفہ دے رہی ہے۔ آٹھ یتیم بچیوں کو ان کی شادی کے موقع پر کچھ رقم

دی جا رہی ہے ان میں سے دو ہندو لڑکیاں ہیں۔ یہ فاؤنڈیشن کی گزشتہ چار برسوں کی کارکردگی ہے، جو کہ ڈوڈہ میں یتیموں اور بیواؤں کے حالات کی سنگینی کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمندر میں ایک قطرے کے برابر بھی نہیں۔ اس بات کو فریدی خود بھی تسلیم کرتا ہے۔

اسی قسم کا ایک گروپ ''جموں و کشمیر یتیم ٹرسٹ'' ہے جس کا ہیڈ کوارٹر ''جموں و کشمیر فاؤنڈیشن'' کی طرح سرینگر میں ہے۔ اس کی ڈوڈہ برانچ کا سربراہ فاروق حسین ہے یہ ایک مقامی تاجر ہے، اس نے اپنی کارکردگی یوں سنائی: ''ہم نے اب تک صرف دو بچوں کو سری نگر کے ایک یتیم خانے میں داخل کرایا ہے۔ ایک لڑکی کو نصابی کتابیں مفت دی ہیں اور غریب خاندانوں کی چودہ لڑکیوں کو ''جہیز کٹس'' دی ہیں، ان میں چند یتیم لڑکیاں بھی ہیں۔

مجھے ''جہیز کٹس'' کے بارے میں تجسس ہوا، میں نے پوچھا یہ کیا چیز ہے، اس پر فاروق حسین نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا کہ وہ مجھے اس کا نمونہ دکھائے۔ چنانچہ اس نے بڑے فخر سے ایک پلاسٹک کا سوٹ کیس لا کر دکھا دیا جس میں چند ایسی اشیا تھیں جنہیں عموماً دلہنیں ساتھ لے جانا پسند کرتی ہیں مثلاً: دو جوڑے شلوار قمیض، ان کا ہم رنگ دوپٹہ، کاسمیٹکس کا ایک ڈبہ، ایک ہینڈ بیگ، ایک برقع (جسے آج کل ڈوڈہ کی مسلم خواتین کم ہی اوڑھتی ہیں) اور ایک جوڑا سینڈل۔ مسٹر حسین کے مطابق اس کی کل مالیت چھ ہزار روپے تھی۔

ان ''این جی اوز'' کا کام ''سیدھا سادہ'' اور ان کا طریق کار کسی قدر محدود ہے۔ تھوڑی سی رقم میسر آتی ہے جسے وہ افراد کی ایک خاص تعداد میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں فعال اور موثر طریق کار اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ''جموں و کشمیر ٹرسٹ'' اور ''جموں و کشمیر یتیم فاؤنڈیشن'' کی محدود بصیرت اور طریق کار سے ہٹ کر ڈوڈہ میں کام کرنے کے لیے ایک ادارہ ''دارالیتامیٰ'' کے نام سے اپریل 2006 میں وجود میں آیا، یہ نئی تشکیل شدہ ''الخیر فاؤنڈیشن'' نے قائم کیا۔ یہ واحد پرائیویٹ طور پر چلنے والا ادارہ پورے ڈوڈہ میں کام کر رہا ہے۔ اس کا انتظام و انصرام مقامی سرگرم کارکنوں پر مشتمل کمیٹی کے ہاتھ میں ہے جس کے چیئرمین مولوی آفتاب احمد کھوکھر (امام مسجد آستانہ مسجد) ہیں۔ یہ مسجد چند صدیاں پہلے ایک ہندو راجپوت خاندان کی طرف سے تحفے کے طور پر دی ہوئی زمین پر تعمیر ہوئی تھی، یہ خاندان صوفی بزرگ شاہ فرید الدین بغدادی کا عقیدت مند تھا۔ یہ

بزرگ کشتواڑ سے متصل قصبے میں مدفون ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کی شادی اسی خاندان کی ایک عورت سے ہوئی تھی۔

مولوی کھوکھر اپنے کام کو اسلام کی سماجی بصیرت کا مظہر قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک انسانیت کے ساتھ محبت، خدا کے خوف اور آخرت کی جوابدہی سے عبارت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے خطابِ جمعہ اور عام مجالس میں تقریروں میں انہی نقاط پر زور دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لوگ مذہب کی سماجی وسعتوں کو عموماً بھول جاتے ہیں اور صرف رسمی عبادات پر توجہ دیتے ہیں۔ انہوں نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ شاندار مساجد کی تعمیر پر لاکھوں روپے خرچ کر دیئے جاتے ہیں مگر غریبوں کے لیے کچھ نہیں کیا جاتا۔

ایک معمر شخص نے ہماری گفتگو کو کاٹتے ہوئے کہا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ لوگ ''این جی اوز'' کو عطیات دینے سے اس لیے ہچکچاتے ہیں کہ ان کے خیال میں بہت سی تنظیمیں محض پیسہ بٹورنے میں لگی ہوئی ہیں۔ اس تاثر کی وجہ سے وہ حقیقی خدمت کرنے والی تنظیموں کو بھی شبہے کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔

میں جونہی دارالیتامیٰ کے خوبصورت اور صاف ہال میں داخل ہوا مجھے بچوں سے متعارف کرایا گیا جو صاف ستھرے لباس میں ملبوس، ہنس مکھ اور شائستہ اطوار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنے استاد کے گرد نیم دائرے میں بیٹھے، اونچی آواز سے قرآنی اسباق سنا رہے تھے۔ یہاں اٹھارہ طلبا تھے جن کی عمریں آٹھ سال سے سولہ سال تک تھیں۔ ان کا تعلق ڈوڈہ کے مختلف حصوں اور پہاڑوں پر واقع دیہات سے تھا۔ ان سب کے والد یا تو عسکریت پسندوں کے ہاتھوں زندگی کھو بیٹھے یا بھارتی فوج کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے یا بعضوں کے والد حادثوں کا شکار ہو گئے یا بوجہ پیرانہ سالی وفات پا گئے تھے۔ سب بے حد غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، دارالیتامیٰ ان بچوں کے لیے گھر کی مانند ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو یہ بچے اپنے دور افتادہ پہاڑی دیہات میں تاریک مستقبل کے حوالے ہو جاتے۔ اب یہاں یہ ایک مقامی پرائیویٹ سکول میں زیرِ تعلیم ہیں جہاں ان کی فیس معاف ہے، یتیم خانہ انہیں قیام و طعام اور اچھی رہائش فراہم کر رہا ہے۔ شام کو سکول سے واپس آنے کے بعد انہیں استاد اور دیگر عملہ سے مذہبی تعلیم ملتی ہے۔

MashalBooks.org

اس عمر کے دیگر بچوں کی طرح دارالیتامیٰ کے بچوں کے بھی اپنے اپنے خواب ہیں جو ڈوڈہ میں ایسے حالات میں سے گزرنے والے بچوں کی مایوسیوں بھری زندگیوں میں امید کی کرن بنتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم ڈاکٹر بنیں گے، کچھ انجینئر اور کچھ قانون دان بننے کی سوچ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بچہ جو کافی ذہین اور ہوشیار دکھائی دے رہا تھا، اس نے کہا کہ وہ صحافی بنے گا۔

دارالیتامیٰ ایک مسلم ادارہ ہے تاہم اس کے دروازے، بقول مولوی صاحب کے، سب مذاہب کے ماننے والوں کے لیے کھلے ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکا جو بالکل دوسرے بچوں کی طرح تھا، اس نے بتایا کہ اس کا نام ''وجے'' ہے۔ وہ برہمن خاندان سے ہے اور ''اُگادھ'' نامی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے، اس کا والد سڑک کے حادثے میں چل بسا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ دارالیتامیٰ میں اکیلا ہندو ہونے کی وجہ سے کیسا محسوس کرتا ہے، اس نے مسکراہٹ اور شرمیلے پن سے کہا کہ میں اپنے گھر کی طرح محسوس ہوتا ہوں، یہ سب میرے دوست ہیں مجھے کسی نے نہیں کہا کہ میں ان سے مختلف ہوں۔

مولوی کھوکھر کہتے ہیں کہ امید ہے کہ اور ہندو طلبا بھی دارالیتامیٰ میں داخلہ لیں گے۔ کیونکہ پورے ضلع ڈوڈہ میں ہندوؤں کے زیر انتظام کوئی یتیم خانہ نہیں چل رہا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ''ڈوڈہ کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ ہندو ہے، اسلام کہتا ہے کہ ہمیں تمام ضرورت مندوں کی قطع نظر ان کے مذہب کے، خدمت کرنی چاہئے۔ چنانچہ اگر ہندو بچے داخلہ لیں تو ہم انہیں خوشی سے قبول کریں گے بشرطیکہ ان کے سرپرست انہیں اجازت دیں۔'' انہوں نے ڈوڈہ کے قریب کلہند نامی گاؤں میں حالیہ قتل عام کا ذکر کیا جس میں نامعلوم بندوق برداروں نے تقریباً دو درجن ہندوؤں کو قتل کر ڈالا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا وہاں کے چند ہندو خاندانوں سے رابطہ ہے، ہم اس افسوس ناک سانحہ میں مارے جانے والوں کے بچوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ چاہیں تو اگلے سال کے داخلوں میں یہاں آجائیں۔

[30، اگست 2006]

MashalBooks.org

ڈوڈہ کی یتیم لڑکیوں کے لیے ریاست کیا کر رہی ہے؟

جب جموں وکشمیر میں عسکریت پھوٹی ہے اس کے نتیجے میں اب تک کئی ہزار بچے یتیم ہو چکے ہیں، ریاست نے ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا بلکہ انہیں ان کی ظالم تقدیر کے حوالے کر دیا ہے۔ ان میں سے لڑکوں کو بہ نسبت لڑکیوں کی حالت زیادہ تشویشناک ہے۔

ڈوڈہ قصبے میں ''ناری نکیتن'' (عورتوں کا گھر) ریاست کے فنڈز سے چلنے والا، ضلع بھر میں اکلوتا یتیم خانہ ہے۔ یہ ضلع، رقبے کے لحاظ سے ساری وادیٔ کشمیر سے بڑا یا صوبہ جموں کے باقی ماندہ اضلاع کے مجموعے سے بھی بڑا ہے۔ ''ناری نکیتن'' 1983 میں قائم ہوا، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ بے گھر خواتین کے لیے بنا ہے، اس میں سردست 25 یتیم لڑکیاں رہائش پذیر ہیں۔ یہ سب اپنے والد سے محروم ہیں اگرچہ ان میں سے بعضوں کی مائیں زندہ ہیں۔ ان لڑکیوں کا تعلق دورافتادہ پہاڑی دیہات اور ضلع ڈوڈہ کے پسماندہ حصوں سے ہے۔ ان کے خاندان معاشی طور مفلوک الحال ہیں۔ ان میں سب سے کم عمر بچیاں تیسری جماعت میں ہیں اور تقریباً نصف درجن میٹرک کے امتحان کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ سب ڈوڈہ کے سرکاری سکولوں میں پڑھتی ہیں جبکہ ان دیگر جُملہ اخراجات کی ذمہ داری ''ناری نکیتن'' پر ہے۔

یہ یتیم خانہ قصبے کے ایک سرے پر ایک تنگ اور اجاڑ گلی میں واقع ہے، دیکھنے میں افسردہ اور فلاکت زدہ گھر وندہ نظر آتا ہے۔ صحن میں نہ باغ ہے نہ کھیل کا میدان ہے، کمرے اندر سے کسی پوشش کے بغیر سیلن زدہ اور نیم روشن ہیں۔ لڑکیاں ایک بڑے ہال

MashalBooks.org

میں رہتی ہیں، ہر ایک کو ایک بیڈ اور ایک لوہے کا ٹرنک ملا ہوا ہے۔ یہی جگہ ہے جہاں یہ سب سوتی، کھانا کھاتی، کھیلتی اور مطالعہ کرتی ہیں۔ یتیم خانے میں کوئی لائبریری نہیں۔ تفریح کا واحد ذریعہ جو ان کے پاس ہے وہ کیرم بورڈ اور چند بیڈمنٹن ریکٹس ہیں۔ ٹیلی ویژن ایک سال سے قابل مرمت پڑا ہوا ہے، متعلقہ حکام سے بارہا شکایت کی گئی لیکن ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو وہ خوشی سے ہنسیں اور ہمارے گرد جمع ہو گئیں انہوں نے جن کپڑوں پر ہنرمندانہ کشیدہ کاری کی تھی یا سٹچنگ کی تھی وہ فخر سے ہمیں دکھائے۔ یہ کام انہوں نے خوش اخلاق کرافٹس ٹیچر زاہدہ بیگم سے سیکھا جو ان کے لیے رضاعی ماں کی طرح ہے۔ انہوں نے پُرجوش انداز میں اپنی سٹڈیز کے بارے میں ہمیں مطلع کیا لیکن ان کے اندر چھپا ہوا غم واضح طور پر جھلکتا تھا۔ وہ صحت کی مناسب سہولتوں کے فقدان پر شاکی تھیں، ان میں بعضوں پر بخار یا خارش کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مقامی لوگ، حتیٰ کہ ہمسائیگی میں رہنے والی عورتیں بھی شاذونادر ہی یہاں چلی آتی ہیں۔ بعض لوگ سال میں ایک یا دو بار تہواروں پر کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھیج دیتے ہیں۔ ایک باتونی لڑکی نے بتایا کہ یہاں بعض عورتیں اگر ملاقات کے لیے آجائیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے، وہ بھی خوش ہوتی ہیں اور ہمیں کچھ نہ کچھ سکھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ڈوڈہ میں مقیم لوگ ان بدقسمت بچیوں سے بس اسی قدر دلچسپی رکھتے ہیں۔

ناری نکیتن کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیال شروع ہوا تو ایک سٹاف ممبر کہنے لگیں ''ہم حکومت سے ہر چیز کی امید کیسے رکھیں، مقامی لوگوں کو بھی آگے بڑھنا چاہیے، وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ مقامی پریس نے اس ادارے کے مسائل پر کبھی چند سطریں تک لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ یہاں کون سی مخلوق رہتی ہے اور اسے کیا کیا مشکلات درپیش ہیں؟ پریس صرف اس وقت لکھتا ہے جب کوئی وی آئی پی اتفاق سے یہاں چلا آئے تو کچھ ہمارا ذکر آجاتا ہے، مگر وہ زیادہ تر اس کے دورے کی بات ہوتی ہے ادارے یا لڑکیوں کے مسائل کی بات نہیں کی جاتی۔

ناری نکیتن کی لڑکیاں مختلف کمیونیٹز سے آئی ہیں، یہ کشمیری، مسلمان، ہندو، دلت اور

گوجر ہیں لیکن ایک دوسری سے بہت دوستانہ روابط رکھتی ہیں۔ ایک لڑکی نے کہا ''ہم عید اور دیوالی ایک ساتھ مناتی ہیں، اور مذہب کا مختلف ہونا کوئی پرابلم نہیں بنتا۔''

مستقبل کے بارے میں لڑکیوں کے اپنے اپنے عزائم اور اپنے اپنے خواب ہیں جن کا انہوں نے ہم سے بہت پُرجوش انداز میں ذکر کیا۔ کچھ ٹیچر بننا چاہتی ہیں، کچھ ڈاکٹر، صحافی اور سوشل ورکر بننا پسند کرتی ہیں۔ یہاں سے جانے والی دولڑکیاں جموں وکشمیر پولیس میں ہیں اور درجن بھر اب ''اگن وادی'' ورکرز ہیں۔ ایک تیز طرار لڑکی نے ''اگر ہم سخت محنت سے پڑھیں تو ہوسکتا ہے کہ ہمیں بھی اس طرح کی اچھی جابز مِل جائیں'' اس نے پیاری مسکراہٹ سے اس خواہش کا اظہار کیا اور اس کی دوستوں نے تائید میں سر ہلائے۔

ضلع ڈوڈہ میں ایسی سینکڑوں لڑکیاں ہیں جن کے باپ کشمکش کے پندرہ برسوں میں فوت ہوئے، اس تعداد میں وہ باپ بھی شامل کریں جو دیگر اسباب کی بنا پر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ڈسٹرکٹ سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ (DSWD) کے ایک ورکر ''آر'' (R) نے بتایا کہ ''پورے ضلع سے صرف 25 لڑکیوں کو یہاں لے سکنا، افسوسناک حد تک کم ہے۔ ہم گورنمنٹ کو ہر سال یادداشت بھیجتے ہیں کہ ناری نکیتن میں کم از کم پچاس لڑکیوں کی گنجائش پیدا کی جانی چاہیے اور ڈوڈہ ضلع کے ساتوں تحصیل ہیڈ کوارٹرز میں کم از کم ایک ایک ایسا ادارہ ضرور قائم کیا جائے بشمول نئے قائم شدہ اضلاع کشتواڑ اور رمبن کے۔ مگر ہماری کسی بات پر دھیان نہیں دیا گیا۔'' یہ بیوروکریٹک لاپرواہیوں اور غلط ترجیحات کا شاخسانہ ہے۔ حکومت کہتی ہے کہ اس کے پاس اس کے لیے فنڈز نہیں ہیں۔ دوسری طرف وہ فوج اور پولیس پر ہر سال کروڑوں اربوں روپے خرچ کر دیتی ہے اسے ان بچوں کے اداروں کے لیے کم از کم چند لاکھ روپے سالانہ ضرور مخصوص کرنے چاہئیں۔''

''آر'' مجھے بتاتا ہے کہ ناری نکیتن کو ہر سال ایک سو سے زائد درخواستیں موصول ہوتی ہیں مگر سالانہ چار یا پانچ بچیوں کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب، بقول اس کے یہ ہے کہ دو دہائیوں سے زائد عرصہ پہلے جب سے یہ قائم ہوا ہے صرف سو سے کچھ زائد لڑکیوں کو اس ادارے سے فائدہ پہنچا ہے۔ اس نے بتایا کہ ناری نکیتن میں موجود نصف درجن سے کچھ کم لڑکیاں ڈوڈہ میں جاری مسلح کشمکش کی ماری ہوئی ہیں جبکہ ایسی لڑکیوں کی کل تعداد اس

MashalBooks.org

سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے بقول نئی دہلی میں قائم ''نیشنل فاؤنڈیشن برائے فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' (NFCH) ان میں سے ہر بچی کے لیے 750 روپے ماہانہ فراہم کر رہی ہے۔ ڈوڈہ میں مجموعی طور پر 470 کے قریب بچے یہ رقم وصول کر رہے ہیں۔ ڈسٹرکٹ سوشل ویلفیئر آفیسر ڈوڈہ کی سرکاری رپورٹ بتاتی ہے کہ ضلع میں یتیم ہونے والے بچوں کے لیے یہ واحد سرکاری سکیم ہے۔ ''ضلع میں اس سے کئی سو سے زائد بچے ہیں جن کے والد تشدد کے واقعات میں قتل ہو چکے ہیں مگر مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ریاست ان کے لیے کیا کر رہی ہے، غالباً کچھ بھی نہیں کر رہی ہے۔''

''آر'' بتاتا ہے کہ ان محدود سہولتوں تک رسائی میں جو مشکلات ہیں وہ اس حقیقت کی وجہ سے مزید پیچیدہ ہو گئی ہیں کہ جن عورتوں کے شوہر عسکریت پسندوں کے ہاتھوں یا عسکریت پسندوں اور فوج کے درمیان کراس فائرنگ میں مارے گئے ہیں اگر وہ ریاست کی مہیا کردہ ایسی اشکال سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں تو انہیں ان بیشمار پیچیدہ کاروائیوں کی تکمیل کرنا پڑتی ہے جو بیوروکریسی نے لازمی قرار دے رکھی ہیں، ان میں سے صرف چند ایک خواتین ہی گزر سکتی ہیں۔ سب سے پہلے انہیں تھانے سے ایف آئی آر کی نقل لینا پڑتی ہے، ''تحصیل'' یا ریونیو اتھارٹیز سے انکم سرٹیفکیٹ، اور ضلع ایجوکیشنل آفیسر کا تصدیق کردہ ایک سکول سرٹیفکیٹ سے لینا پڑتا ہے، تب بھی ''این ایف سی ایچ'' چاہے تو کسی چھوٹے سے ٹیکنکل فالٹ کی بنیاد پر، درخواست مسترد کر سکتی ہے، مثلاً فوٹو کاپی واضح نہیں ہے یا ایپلیکیشن فارمز مکمل نہیں ہیں۔

جس طریقے سے ناری نکیتن کے قواعد بنائے گئے ہیں اس سے یہ ادارہ اتنا موثر نہیں ہو سکا جتنا کہ یہ ہو سکتا تھا۔ جونہی لڑکیاں میٹرک تک تعلیم مکمل کرتی ہیں انہیں ادارہ چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کی آگے کی تعلیم ناممکن ہو جاتی ہے۔ جو لڑکیاں کسی ایک سطح کے امتحان میں فیل ہو جاتی ہیں وہ بھی مزید نہیں ٹھہر سکتیں۔

ایک لڑکی جس سے میں ناری نکیتن کے وزٹ میں ملا تھا وہ میٹرک کے امتحان کے چند پرچوں میں رہ گئی تھی۔ وہ بہت ہی غریب خاندان سے تھی اس کا باپ اور اس کی ماں، دونوں عسکریت پسندوں کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے، اس نے مجھے بتایا کہ ''میں تعلیم مکمل

کرنا چاہتی ہوں زندگی میں کوئی مفید کام کرنے کے لیے میٹرک پاس ہونا تو بہت ضروری ہے، یہ تبھی ہوسکتا ہے کہ مجھے ڈوڈہ ٹاؤن کے گورنمنٹ سکول میں داخلہ ملے اور میرا قیام ناری نکیتن میں ہو لیکن قواعد کہتے ہیں کہ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی، تو پھر میں کیا کروں؟ میں نے ڈسٹرکٹ کلکٹر سے رابطہ قائم کرنے کا سوچا ہے، مگر وہ ایک بڑا آدمی ہے، اس نے رنجیدہ لہجے میں کہا، مجھے اس سے کون ملنے دے گا۔

ناری نکیتن کا سٹاف کافی مستعد اور فرض شناس دکھائی دے رہا تھا۔ سب بچوں کی دیکھ بھال فکر مندی سے کرتے تھے، ان کے لیے ایک بڑا مسئلہ بیوروکریسی کا جمود، تصور کی کوتاہی اور اس کی غفلت شعاری ہے، میں نے ''ڈی ایس ڈبلیو ڈی'' آفس کے ایک شخص سے، جس سے میری دوستی ہو چکی تھی، پوچھا کہ ایسا کیوں ہے کہ ناری نکیتن کے پاس بچوں کے لیے کتابوں جیسی بنیادی چیز بھی نہیں ہے؟

''فنڈز کی کمی ہے'' وہ بولا

میں نے کہا ''لیکن یقیناً، ایک الماری اور چند درجن بچوں کی کتابوں پر بمشکل ایک ہزار روپے سے زیادہ خرچ آئے گا''

اس نے کہا، ''اس سال ہم ایک سکینڈ فلور تعمیر کر رہے ہیں۔ جس میں ایک ڈائننگ ہال، ایک لائبریری اور ایک کمرۂ ملاقات ہوگا جس میں لڑکیوں کے رشتہ دار آ کر ان سے مل سکیں گے۔

میں نے سوال کیا مگر ایسا کیوں ہوا ہے کہ ناری نکیتن کے قائم ہونے کے 23 برس گزرنے کے باوجود حکام نے ایک چھوٹی سی بھی الماری نہیں بنوائی جس میں چند کتابیں، روزانہ کے اخبارات اور بچوں کے لیے گیمز پڑی ہوں؟ میرے اس استفسار پر اس مخلص انسان کندھے اچکاتے ہوئے کہا، ''کیا بتاؤں بھائی! آپ جانتے ہی ہیں کہ سرکاری محکمے کیسے کام کرتے ہیں۔''

پھر اس نے بتانا شروع کیا.....سابق ضلع ڈوڈہ کی سات تحصیلوں میں سال ہا سال سے سوشل ورکرز کی سات پوسٹیں خالی پڑی ہیں، جو کہ حکومت کی بے حسی اور سنگدلی کی نشاندہی کر رہی ہیں۔ ضلعی سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ (ڈی ایس ڈبلیو ڈی) پورے ضلعے میں

ایک ''این جی او'' پدھر (کشتواڑ) میں ایک بودھسٹ گروپ کے زیر انتظام چلنے والے سکول کے لیے دے رہا ہے۔ اس کے اسباب یہ ہیں:

یہاں خال خال ہی کوئی مخلص ''این جی او'' پائی جاتی ہے، زیادہ تر پیسہ بٹورنے میں لگی ہوئی ہیں، حکومت کی سکیموں میں آگاہی کا فقدان ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ضلع بھر میں تعلیم اور صحت کے شعبوں میں کام کرنے والی بیشتر تنظیمیں تجارتی بنیادوں پر چلائی جا رہی ہیں۔ ''ضلع ڈوڈہ'' میں اس نے بتایا کہ ''متعدد افراد نے سوشل ورک میں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کر رکھی ہے مگر کسی نے کوئی سماجی تنظیم قائم نہیں کی۔ ان میں سے بیشتر نے یہ ڈگریاں محض سرکاری ملازمتوں کے حصول کے لیے کی ہیں۔'' اس نے بددلی سے کہا حکومت پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے یتیموں کے لیے کوئی کام نہیں کیا مگر سول سوسائٹی تنظیمیں بھی تو برائے نام ہی کام کر رہی ہیں۔ بڑے طاقتوروں کے لیے ایسے بچوں کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے۔

[20، ستمبر 2006]

MashalBooks.org

کلہند: قتل عام کے ایک ماہ بعد

پچھلے ماہ کے اوائل میں ڈوڈہ کے ایک دور افتادہ پہاڑی گاؤں کلہند میں نا معلوم گن مینوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر کے 22 ہندوؤں کو ہلاک کر دیا۔ مقامی رائے اس بات پر دو حصوں میں منقسم ہے کہ اس قتل عام کا کون ذمہ دار ہے؟ بہت سے مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہر جگہ موجود ''ایجنسیوں'' کی ہنر مندی کا مظاہرہ ہے۔ ڈوڈہ کا ایک مسلمان ٹیچر ''ایچ'' (H) کہتا ہے کہ یہ پاکستانی انٹلی جنس کا کام بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ امکان بھی ہے کہ یہ انڈین آرمڈ فورسز کی کارستانی ہو جیسا کہ 2000ء میں چھتیس پورہ میں انہوں نے 35 سکھوں کو بھون ڈالا تھا۔ اس کے بارے میں بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انڈین آرمی نے ایک منصوبے کے تحت یہ کاروائی کی اور اسے عسکریت پسندوں کے سر تھوپ دیا۔ جس کے بعد آرمی نے ''پتھریبل'' میں پانچ معصوم مسلمان دیہاتیوں کو قتل کر کے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ سکھوں کے قتل کے ذمہ دار تھے۔ عسکریت پسندوں اور انڈین فورسز نے کشمیر میں بہت سے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ کلہند کے قتل کے پیچھے کون تھا۔

ڈوڈہ کے ایک مسلمان دکاندار ''ایل'' (L) کا کہنا ہے کہ ''ماضی میں کشمیری عسکریت پسندوں نے جب بھی لوگوں کو اس طرح قتل کیا ہے کسی ایک یا دوسرے عسکریت پسند گروپ نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی تھی لیکن اس کیس میں کسی گروپ نے ایسا نہیں کیا۔ حُریت لیڈر مقتولین کے خاندانوں سے اظہار ہمدردی کے لیے کلہند پہنچے اور بہت سی عسکریت پسند تنظیموں نے اس اقدام کی مذمت کی ہے''

''آر'' (R) ایک مسلمان طالب علم ہے، اس کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ یہ قتل عام

کانگریس کے سیاسی حریفوں نے کیا ہو کیونکہ یہ وزیر اعلیٰ غلام نبی آزاد کی بھدرواہ میں شاندار کامیابی کے فوراً بعد وقوع پذیر ہوا تھا۔ ''ایسا کرنے والوں کا مقصد غلام نبی آزاد کو بدنام کرنا، اس کی حکومت کو غیر مستحکم کرنا اور ڈوڈہ کو فرقہ وارانہ خطوط پر تقسیم کرنا ہوسکتا ہے تاکہ بی جے پی قسم کی سیاسی پارٹیوں کو فائدہ پہنچایا جائے جو ہندو مسلم کشمکش پر پلتی ہیں۔'' دوسری طرف وہ یہ رائے بھی دیتا ہے ''ہوسکتا ہے کہ یہ کاروائی بعض دہشت پسند گروہوں کی ہو جو حالیہ انتخابات کے نتائج پر صدمے سے دوچار ہو گئے اور انہیں اس حقیقت کا احساس ہو گیا ہے کہ مسلمان عسکریت پسندی سے اکتا چکے ہیں، اس لیے اب وہ ہانڈی کو حالتِ ابال پر رکھنے کے لیے فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانا چاہتے ہیں۔''

خود کلہند کا ایک ہندو ''اے'' (A) قتل عام کی اس کہانی کو دلچسپ موڑ دیتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے کہ جس روز یہ واقعہ رونما ہوا گاؤں کی فاریسٹ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا یہ مقامی ہندوؤں پر مشتمل ہے اور اجلاس کلہند کے ایک ہندو سکول ماسٹر کے گھر میں تھا، کاروائی کے دوران کسی معاملے پر تلخ کلامی ہوگئی ایک شخص نے دوسروں کو سنگین نتائج کی دھمکی دے دی۔ اس نے بتایا کہ ''ممکن ہے کہ اس شخص نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مقامی عسکریت پسندوں سے مدد مانگ لی ہو۔'' اس نے جس شخص کی طرف اشارہ کیا تھا اس نے اس الزام کی تردید کر دی۔ اس نے گاؤں کے دیگر ہندو خاندانوں سے اپنے تین نسلوں کے تعلقات کا حوالہ دیا اور یہ اعتراف بھی کیا کہ اس کے ہندوؤں کی بہ نسبت گاؤں کے مسلمانوں سے سماجی تعلقات زیادہ گہرے ہیں۔ اس نے بہ اصرار کہا کہ ''میرے گاؤں کے ہندوؤں کے ساتھ متعدد مقدمات معرضِ التوا میں پڑے ہوئے ہیں، مگر میں نے کبھی دھمکیاں نہیں دیں، میرا اس قتل عام سے کوئی تعلق نہیں۔''

ڈوڈہ کے بہت سے مسلمان، عسکریت پسندوں پر اس قتل عام کا الزام لگاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ جب تک غیر جانبدارانہ تفتیش مکمل نہ ہو جائے کوئی رائے قائم نہیں کی جانی چاہئے، بیشتر ہندو اور بعض مسلمان بھی اس سے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ کلہند کا ایک راجپوت ''ٹی'' (T) جس کا اس واقعے میں بیٹا قتل ہو گیا تھا اس کا اصرار ہے کہ یہ کام عسکریت پسندوں سے کرایا گیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کے قاتلوں کو

اس واقعے سے کوئی پندرہ روز پہلے گھومتے ہوئے دیکھا تھا۔''ان کے لمبے لمبے بال اور داڑھیاں تھیں اور ایک دوسرے سے کشمیری زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔''ٹی'' نے یہ بھی کہا کہ عسکریت پسند اکثر ان دور دراز دیہات میں ہندو گھرانوں میں آتے ہیں، ان کے ہاں کھانا کھاتے ہیں اور قیام بھی کرتے ہیں۔''وہ ہم سے جو کچھ مانگیں ہم دیتے ہیں اور اپنی جانوں کے ڈر سے فوج کو ان کا اتہ پتہ بتانے سے گریز کرتے ہیں۔ ہمارے اس تعاون اور مہربانی کا ہمیں یوں بدلہ ملتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سسکیاں لے کر رونے لگا۔

''این'' (N) ایک بیوہ ہے جس کا اکلوتا بیٹا، اس قتل عام میں مارا گیا تھا، اس نے اسی خیال کا اعادہ کیا''جو لوگ کہتے ہیں کہ عسکریت پسند اس واقعے کے پیچھے نہیں ہیں وہ صرف اس بات کا انکار کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کسی بھی دوسرے گروہ کی طرح ایسے گھناؤنے جرائم کر سکتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ عسکریت پسندوں نے اس لیے ایسا نہیں کیا ہوگا کہ اسلام اس سے منع کرتا ہے مگر یہ عسکریت پسند ہرگز پرہیزگار مذہبی لوگ نہیں ہیں۔ یہ سراسر جرائم پیشہ لوگ ہیں۔'' جیسے وہ اس المناک دن کے واقعات سناتی ہے اس کے ہندو اور مسلمان پڑوسیوں کے چہروں پر غم کے بادل چھا جاتے ہیں اور فضا سوگوار ہو جاتی ہے۔ ایک نوجوان مولوی صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جب میں''ٹی'' کے گھر سے نکلا تو اس کے ایک مسلمان پڑوسی''ایس'' (S) نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا''بعض عسکریت پسند گروہ غیر مسلموں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے اسلام کی من مانی تعبیر کرتے ہیں، لیکن وہ ہمارا اسلام نہیں ہے۔ اسلام وہ ہے جو صوفی ہمیں سکھاتے ہیں، ہمارے آباؤ اجداد نے، جو ہندو ہوا کرتے تھے، انہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا۔'' ''ایس'' نے مزید کہا کہ عسکریت پسندی کو پہلے جو مقبولیت حاصل تھی وہ اب کافی حد تک کم ہو چکی ہے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جرائم پیشہ افراد کس طرح عسکریت پسندوں کے اندر گھس چکے ہیں۔ اور اب ہمیں یہ احساس بھی ہو گیا ہے کہ پاکستان کے حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے اور یہ بھی کہ پاکستان کی کالونی بننے سے بہتر یہی ہے کہ ہم بھارت کے ساتھ رہیں۔''

قتل عام سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیری یا بیرونی عسکریت پسند، اگر وہ اس کام کے واقعی

ذمہ دار ہیں، تو وہ مایوس ہو رہے ہیں۔ ''ایس'' کہتا ہے ''وہ سرینگر میں ہونے والے حالیہ امن مذاکرات کو سبوتاژ کرنا اور فرقہ وارانہ تقسیم کا دائرہ مزید وسیع کرنا چاہتے تھے لیکن اب ''بی جے پی'' مسئلے کو اٹھا رہی ہے اور یہ افواہیں پھیلا رہی ہے کہ ڈوڈہ کے مسلمان ہندوؤں کا نسلی صفایا کرنا چاہتے ہیں، یہ دراصل دہشت گرد تنظیموں کے ہاتھوں میں کھیلنے کے مترادف ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بیشتر مسلمان ہندوؤں کے ترک وطن کرنے کے مخالف ہیں جبکہ ہمارے لیڈروں نے امن اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے اپیلیں جاری کی ہیں۔ ''ایس'' نے مجھے بتایا کہ ڈوڈہ ضلع میں قتل عام کے واقعہ کے خلاف احتجاجی ہڑتال کو منظّم کرنے میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا۔ ''حتیٰ کہ جماعت اسلامی کے سید علی گیلانی نے، جو پاکستان کے ساتھ الحاق کی وکالت کے لیے مشہور ہیں، متاثرینِ قتل عام کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لیے کلہند آنے کی کوشش کی تھی لیکن پولیس نے انہیں نہیں آنے دیا تھا۔ جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی نے بعد ازاں کلہند میں آ کر اعلان کیا کہ جماعتیں ایسے بچوں کے تعلیمی اخراجات برداشت کرے گی جن کے رشتہ دار قتل عام میں مار دیئے گئے ہوں۔ ممتاز مقامی مسلم لیڈر، سماجی رہنما اور ڈاکٹرز ہندوؤں کے ہمراہ کلہند آئے جہاں انہوں نے متاثرین قتل عام کو امداد کے طور پر سامان دیا اور ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ امام جامع مسجد ڈوڈہ نے قصبے کے بڑے مندر کے پروہت کے ساتھ مل کر اس وحشیانہ کاروائی کی مذمت کی تھی۔''

قتل ہونے والے ایک ہندو نوجوان کے بھائی ''آر''(R) نے کہا کہ ہمارے علاقے میں نہ 1947 میں تقسیم ہند کے موقع پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور نہ ہی کشمیر میں عسکریت کے عروج کے دنوں ہوئے، گاؤں کے مسلمان ہمارے لیے بھائیوں کی طرح ہیں، ہم ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں، شادی غمی کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں کوئی ضرورت پڑے تو ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ ہمارے مسلمان پڑوسیوں نے اس واقعہ میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں اٹھانے اور جلانے کی رسم کی ادائیگی میں بھی ہماری مدد کی تھی لیکن ''آر'' نے اعتراف کیا کہ جس طرح دوسرے علاقے سے ہندو فرار ہوئے ہیں اسی طرح اس گاؤں کے بعض ہندو بھی نقل مکانی کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور یہ مزید

MashalBooks.org

حملوں کے خوف سے کیا جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ ''ایک بات بہت واضح ہے کہ ہمارے پڑوسیوں اور عسکریت پسند وں میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے گاؤں کے مسلمان عسکریت پسندوں کے مخالف ہیں مگر ان کے خلاف بول نہیں سکتے کیونکہ وہ بھی قتل ہونے سے ڈرتے ہیں لیکن اس واقعے کے بعد شک وشبہے کی ایک دیوار کھڑی ہو چکی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کون کس ایجنسی کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہے اور ہمارے درمیان صدیوں سے جو اعتماد چلا آ رہا تھا ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے مسلمان ہمسائے اصرار کر رہے ہیں کہ ہم گاؤں نہ چھوڑیں لیکن وہ یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ وہ ہمیں عسکریت پسندوں سے تحفظ نہیں دے سکتے۔''

''آر'' مزید کہتا ہے ''ہم نہیں جانتے کہ قتل عام کے پیچھے کون ہے، حکومت کے پاس وسائل ہیں اسے فوراً غیر جانبدارانہ انکوائری کر کے شبہات کو دور کر دینا چاہیے۔'' ڈوڈہ میں میری جن مسلمانوں اور ہندوؤں سے ملاقات ہوئی یہی مطالبہ دوہرا رہے تھے۔

''آر'' کا ہند چھوڑ کر ڈوڈہ یا ادھم پور جانے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے لیکن ''جی'' (G) جو ایک قتل ہونے والے ہندو سکول ٹیچر کا بیٹا ہے یہیں رہنے کا عزم کئے ہوئے ہے۔ وہ کہتا ہے ''ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔ یہاں ہماری زمینیں ہیں ہمارے مال مویشی ہیں ہم کہیں اور گئے تو ہم سے بھکاریوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ ہم اپنے آباؤ اجداد کی طرح یہیں مریں گے۔'' وہ کہتا ہے ''ہم ہندو ہی خوفزدہ نہیں ہیں، ہندوؤں سے زیادہ یہاں کے مسلمان، عسکریت پسندوں اور مختلف ایجنسیوں کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔ اس طرح ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ مقدر جڑا ہوا ہے۔ یہاں فرقہ واریت بڑا مسئلہ نہیں، ہماری مقامی مسلمانوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں، مگر چُن چُن کر قتل کئے جانے کے باعث ایک نفسیاتی خوف پیدا ہو گیا ہے۔ چند مسلم عسکریت پسند گروپ اور بی جے پی ڈوڈہ میں فرقہ وارانہ تقسیم کو وسعت دینے پر کمربستہ دکھائی دے رہے ہیں۔'' اس نے مزید کہا ''عام ہندو اور عام مسلمان اس کے سخت خلاف ہیں'' اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے کہا ''لیکن جب ہمارے مقدر کا فیصلہ باہر بیٹھے ہوئے کر رہے ہوں تو ہم چھوٹے لوگ کیا کر سکتے ہیں۔''

[12، جولائی 2006]

MashalBooks.org

کلہند: قتل عام کے آٹھ ماہ بعد

آٹھ ماہ قبل نامعلوم گن مینوں نے کشمیر کے ضلع ڈوڈہ کے گاؤں کلہند میں گولیوں کی بوچھاڑ کر کے تقریباً دو درجن ہندوؤں کو ہلاک کر دیا، اس کشت وخون سے بچ جانے والے افراد اب کئی ماہ سے اپنی زندگیوں کو دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اس واقعہ کے متاثرین میں ایک بیوہ دملو دیوی ہے، وہ اگرچہ چالیس کی دہائی کی عمر کی ہے لیکن اس سے کم از کم بائیس سال زیادہ عمر کی دکھائی دے رہی ہے ،اس کا اکلوتا بیٹا جگدیش گولیوں کی زد میں آ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اس کی ایک پوتی بھی قتل ہوگئی تھی۔ اس نے آہیں اور سسکیاں بھرتے ہوئے کہا، ''اس سانحے نے مجھے تقریباً پاگل کر دیا ہے۔'' اب وہ اپنی بیوہ بہو اور اس کے پانچ بچوں کے ہمراہ اس کے جھونپڑے میں زندگی کے دن گزار رہی ہے۔ جگدیش جو اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا، دلت میگھ ذات کے کئی اور لوگوں کی طرح یومیہ اجرت پر کام کرتا تھا، یہ لوگ گاؤں کی ایک بڑی اقلیت سمجھے جاتے ہیں۔ اب جبکہ جگدیش اس دنیا میں نہیں رہا، اس خاندان کے پاس پتھریلی زمین کے ایک چھوٹے سے پلاٹ میں ہل چلانے کے سوا زندہ رہنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

دملو دیوی کا کہنا ہے ''حکومت سے ہمیں دو لاکھ روپے معاوضہ ملا تھا، مگر اس میں سے چالیس ہزار بہو کے علاج پر خرچ ہو چکے ہیں، اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی، اب زخم مزید بگڑ گیا ہے اس کے لیے ٹھیک سے چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ دملو دیوی کے پوتوں میں سے ایک کو پولیو کی بیماری ہے اس کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا ہے۔ ہمیں ان دونوں کے لیے ہر ماہ کافی دوائیں خریدنا پڑتی ہیں۔ ہمیشہ فکر لگی رہتی ہے کہ بینک میں پڑی رقم جب ختم ہوگئی تو

پتہ نہیں کیسے جئیں گے۔'' وہ کہتی ہے کہ ''ہمارے دو بیل ہوا کرتے تھے لیکن جب سے جگدیش فوت ہوا ہے ہمارے پاس کوئی بھی نہیں تھا جو انہیں روزانہ چرا کر لاتا۔ اس لیے وہ فروخت کرنا پڑے۔

یہ کچا جھونپڑا جو ایک کمرے کا ہے، یہ دراصل مویشیوں کی پناہ گاہ ہے۔ یہ اب خاندان کے لیے ایک تنگ و تاریک اور دھوئیں سے بھری جگہ ہے جہاں سانس لینے کے لیے صاف ہوا بھی میسر نہیں ہوتی۔ خاندان کی ''جائیداد'' چند کمبل، برتن اور ہانڈیاں ہیں جو ''کمرے'' میں ٹھنسی ہوئی ہیں۔ دملو دیوی کے پانچ پوتے پوتیاں ہیں، سب سے بڑا پوتا تقریباً تیرہ برس کا ہے جو غمزدہ رہتا ہے اور اس وقت چولہے کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا یہ سارے بچے کم غذا ملنے کے باعث لاغر دکھائی دے رہے ہیں، ان کے جسم گرم کپڑوں کو ترستے رہتے ہیں پتہ نہیں یہ آنے والی سردیوں کا کیسے مقابلہ کریں گے۔

اس خاندان کے پاس پہلے ایک درمیانے درجے کا مکان تھا، لیکن قتل عام کے بعد وہ گاؤں میں قیام کرنے والے آرمی یونٹ کو کرائے پر دے دیا گیا ہے۔ اگرچہ آرمی آنے کی وجہ سے انہیں حفاظت کی ضمانت مل گئی ہے مگر کوئی زیادہ اقتصادی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ کرایہ صرف300روپے ماہوار ملتا ہے۔

دملو دیوی نے اخبار کا ایک تراشہ نکال کر دکھایا جس پر اس کے مقتول پوتے کی تصویر چھپی ہوئی ہے۔ وہ مجھے یہ دکھا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میں باہر نکلا تو آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ دملو دیوی ان بادلوں سے کیا پیغام لے رہی ہوگی اور اس کا دماغ کیسے محسوس کر رہا ہوگا، یہ صرف خدا ہی جانتا ہے۔

[23، دسمبر2006]

MashalBooks.org

ڈوڈہ میں ویلیج ڈیفنس کمیٹیوں کا قیام

1955 میں ڈوڈہ میں مسلم عسکریت پسندوں کے ہاتھوں ہندوؤں کے ایک بڑے گروپ کے بھیانک قتلِ عام کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کو ضلعے میں عسکریت سے نمٹنے کے لیے ایک نیا خیال سوجھا جس کا نتیجہ دیہی تحفظ کمیٹیوں (''ویلیج ڈیفنس کمیٹیز'' VDCs) کے قیام کی صورت میں نکلا۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ ڈوڈہ ایک دشوار گزار، وسیع پہاڑی علاقہ ہے جس کے گھنے پُر خطر جنگلاتی ڈھلوانوں پر چھوٹے چھوٹے گھروں کے جھنڈ جا بجا بکھرے پڑے ہیں اور ہر بستی میں فوجی قلعہ بندیاں (pickets) قائم کرنا ناممکنات میں سے ہے، عسکریت کے مقابلے کے لیے خود مقامی لوگوں کو ہی مسلح کر کے دیہی تحفظ کمیٹیوں کا قیام حکومت کو زیادہ قابل عمل منصوبہ دکھائی دیا، اس میں شاید اسے روپے کی بہت سی بچت بھی نظر آئی تھی۔ چنانچہ کمیٹیوں کے ہر رکن کو اس خدمت کے عوض 500 روپے مہینہ اجرت ادا کرنا بہت آسان دکھائی دیا کیونکہ اس طرح حکومت وہ کروڑوں روپے بچانے میں بھی کامیاب ہوگئی جو اسے مین روڈ سے بہت دور واقع دیہات میں فوجیوں کو تعینات کرنے پر لگانے پڑ سکتے تھے۔

پہلے یہ کام ڈوڈہ میں شروع کیا گیا۔ پھر دیہی تحفظ کمیٹیاں جموں و کشمیر کے ان عسکریت زدہ حصوں میں قائم کی گئیں جہاں ہندو اقلیت خاصی تعداد میں پائی جاتی تھی، ان میں راجوڑی، پونچھ اور ضلع اُدھم پور کے بعض حصے شامل تھے۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق پورے جموں و کشمیر 3700 سے زائد ''دیہی تحفظ کمیٹیاں'' قائم کی گئیں۔ جبکہ ضلع ڈوڈہ میں ان

MashalBooks.org

کی صحیح تعداد کا آسانی سے اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اس لیے کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ تعداد بتائی ہے۔ بعض ایسے ذرائع کے مطابق (جن کی صحت کی تصدیق نہیں ہوسکتی مگر وہ کسی قدر معقول دکھائی دیتی ہیں) اس وقت ضلعے میں 1500 سے زائد دیہی تحفظ کمیٹیاں ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے۔ ہر کمیٹی اندازاً آٹھ افراد پر مشتمل ہے، ان میں سے ہر ایک کو حکام کی طرف سے ہتھیار ملتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈوڈہ میں 12,000 یا اس سے زائد مسلح سویلنز کا نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔

ارکانِ کمیٹی اسی گاؤں کے باشندے ہیں، ان کا انتخاب گاؤں کے بزرگ کرتے ہیں جن کی حتمی منظوری بعد میں حکام سے لی جاتی ہے جو ہر رکن کمیٹی کو ''تھری ناٹ تھری'' (.303) رائفل مہیا کرتی ہے، ان کے فرائض یہ ہیں کہ وہ گاؤں کا گشت کریں، اس کا عسکریت پسندوں سے دفاع کریں اور حکام کو عسکریت پسندوں کی نقل و حرکت سے باخبر رکھیں۔

بطور تھیوری تحفظ کمیٹیوں کا تصور بہت بھلا لگتا ہے اور متعدد جگہوں پر انہوں نے عسکریت پسندوں کے حملے ناکام بھی بنائے ہیں اور وہ ایسے دیہات میں داخل ہونے سے ہچکچاتے رہے جن میں یہ کمیٹیاں موجود ہوتی تھیں۔ بعض دیہات میں سخت مقابلے ہوئے اور عسکریت پسندوں کو بھگا دیا گیا۔ تاہم ساری کہانی یہیں تک نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محسوس ہونے لگا کہ یہ کمیٹیاں دراصل اپنے لیے خود مسائل کھڑے کر لیتی ہیں، جنہیں حکام نے نظر انداز کرنے میں ہی سہولت سمجھی اور آج یہ کمیٹیاں ڈوڈہ میں ایک بڑے تنازعے کا روپ دھار چکی ہیں۔

اس تنازعے کا ایک سبب ان کمیٹیوں کی فرقہ وارانہ ساخت ہے۔ ارکانِ کمیٹی کی بھاری اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے اگرچہ مسلمان ضلع ڈوڈہ کی آبادی میں کسی قدر کم اکثریت رکھتے ہیں۔ بھدرواہ کے قریبی گاؤں ''ادرانہ'' کے ہندو دکاندار رمیش کا کہنا ہے ''ہندو، عسکریت پسندوں کا اہم نشانہ ہوتے ہیں اور وہ ہمیں ڈوڈہ سے بھاگ جانے پر مجبور کر رہے ہیں چنانچہ ہمیں اپنے دفاع کے لیے ان کمیٹیوں کی اشد ضرورت ہے۔ کشتواڑ کے ایک طالب علم سنیل کمار کا خیال ہے کہ ''اگر تحفظ کمیٹیاں دلوں میں خوف پیدا کرنے کے

قابل نہ ہوتیں تو عسکریت پسند اب تک ہمیں ضلع سے کھدیڑ چکے ہوتے۔

اس دعوے میں یقیناً کسی قدر صداقت موجود ہے۔ جن دیہات میں سویلین آبادی کے پاس اسلحہ ہو عسکریت پسند ان میں داخل ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ان کی اپنی جان خطرے میں پڑسکتی ہے۔ مجھے بالکل یہی بات ہتھیار ڈال دینے والے ایک عسکریت پسند سلیم نے بتائی جس سے میں کشتواڑ میں ملا تھا۔ تھتھری کے قریب کے ایک گاؤں کے ایک مسلمان اللہ بخش نے کہا ''لیکن عسکریت پسندوں کو تحفظ کمیٹیوں والے دیہات پر حملہ کرنے کی ترغیب بھی مل سکتی ہے کیونکہ جن دیہاتیوں کے پاس ریاست کی دی ہوئی رائفلیں ہوں اور انہیں تنخواہ بھی ملتی ہو تو انہیں واقعتاً ریاست کے پکے ایجنٹ سمجھا جا سکتا ہے۔'' اس نے ایک اور بات خاص زور دے کر کہی ''303. رائفلیں جو تحفظ کمیٹیوں کے رضا کاروں کے پاس ہیں وہ عسکریت پسندوں کے جدید اسلحہ کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتیں۔ اس لیے یہ لوگ عسکریت پسندوں کے خلاف نہ صرف موثر نہیں ہوتے بلکہ ان کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتے۔ اگر عسکریت پسند قلعہ بند فوجی کیمپوں پر یلغار کر سکتے ہیں تو چند ایک 303. رائفلیں ان کے لیے کیا رکاوٹ بن سکتی ہیں؟

ڈوڈہ کی ایک ہندو طالبہ نوین کسی حد تک اتفاق کرتے ہوئے کہتی ہے ''ارکانِ تحفظ کمیٹی کو بہت تھوڑی سی تربیت ملی ہوئی ہوتی ہے وہ اپنے اسلحے کو اس مہارت کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے جو عسکریت پسندوں کے پاس ہوتی ہے انہیں ملنے والا مشاہرہ بھی بہت کم ہوتا ہے، وہ بھی کئی کئی مہینوں کے بعد ملتا ہے۔''

ڈوڈہ میں ملنے والے کئی لوگوں نے مجھے بتایا کہ تحفظ کمیٹیوں کے کئی لوگ اپنی ذات کو قانون سمجھتے ہیں، تھتھری کے قریب مجھ سے ملنے والے ایک پولیس مین نے شکایت کی کہ ''سرکاری ملازمین کو تحفظ کمیٹیوں کے رکن بننے کی اجازت نہیں ہے۔ کالج کے نوجوان بھی ان میں موثر کردار ادا نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اپنا زیادہ وقت گاؤں سے باہر گزارتے ہیں، ان کمیٹیوں کے کئی ارکان محض ویلیج ٹاوٹ ہوتے ہیں، ان کی یا تو بالکل تعلیم نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے، ان میں سے بہت سے بدمعاش ہوتے ہیں۔''

تحفظ کمیٹیوں کے ارکان کے بارے میں ایسی بے شمار کہانیاں سننے کو ملتی ہیں کہ وہ ذاتی

رقابتوں کے لیے رائفلیں استعمال کرتے ہیں۔ بعض اپنے اختیارات کو غلط استعمال کرتے ہوئے دکانیں لوٹتے ہیں، عورتوں کو اغوا کرتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو قتل بھی کر ڈالتے ہیں۔ ان زیادتیوں کا نشانہ صرف مسلمان ہی نہیں بنتے بلکہ بہت سے کیسوں میں ہندو بھی بنتے ہیں لیکن جو بات شاید سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے وہ یہ ہے کہ ان کمیٹیوں کے کئی ارکان دائیں بازو کے ہندو گروپوں کے ہاتھوں استعمال ہوتے ہیں اور ڈوڈہ میں مذہبی اختلافات کی خلیج کو مزید وسعت دے رہے ہیں۔ جو پہلے ہی کافی وسیع چلی آ رہی تھی۔ باہمی اختلافات کو بڑھانے میں پچھلے پندرہ سالہ واقعات کا بہت دخل ہے عسکریت پسند اور آرمی دونوں مل کر سویلینز کو مظالم کا نشانہ بناتے چلے آ رہے ہیں۔

جموں سے نکلنے والے کثیر الاشاعت اخبار ''کشمیر ٹائمز'' نے حال میں اپنے اداریئے میں بالکل بجا لکھا ہے کہ ''ڈوڈہ میں تحفظ کمیٹیوں کے بہت سے ارکان خود کو مسلّمہ اتھارٹی سمجھ کر دہشت انگیزی کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کو چاہتے ہیں موت کی گھاٹ اتار دیتے ہیں، اپنے ذاتی انتقام کی خاطر کسی اخلاقی ضابطے کو خاطر میں نہیں لاتے، سویلنز کو نشانہ بنا کر انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے نہ صرف بڑے پیمانے پر مذہبی اور نسلی منافرتوں کو بھڑکایا، بلکہ ان کا اپنا وجود ہی بین الاقوامی اور ملکی قوانین کے لیے ایک چیلنج ہے۔''

ڈودہ میں بیشتر تحفظ کمیٹیوں کی تشکیل فرقہ وارانہ خطوط پر ہوئی ہے جو صرف ایک ہی کمیونٹی کے ارکان پر مشتمل ہیں۔ ضلع میں ان کمیٹیوں کی بھاری اکثریت ہندو ہے، ان کی بہت ہی تھوڑی تعداد مسلمان ہے جبکہ صرف چند ایک ہی دونوں کمیونٹیز پر مشتمل ہیں۔ اس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ ریاست زیادہ تر صرف ایک کمیونٹی کے ارکان کو مسلح کرتی رہی ہے جبکہ ضلعے کی دوسری بڑی کمیونٹی کو اس معاملے میں بالکل کھڈے لائن لگا دیا گیا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اتنے حسّاس معاملے میں ایسا عدم توازن جس میں سویلینز کو اتنے بڑے پیمانے پر مسلح کر دیا گیا ہے ڈوڈہ کے مسلمانوں میں سخت ناراضگی پیدا ہو گئی ہے۔

بھدرواہ میں بی جے پی کے پُر جوش سپورٹر راجیش نے دعویٰ کیا ''جب پہلے پہل تحفظ کمیٹیاں قائم ہوئیں ان میں شمولیت کے لیے مسلمانوں کو بھی دعوت دی گئی تھی مگر وہ انکاری

ہو گئے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بہت سے عسکریت پسندوں کے مددگار تھے۔ انہیں ان سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا، اس لیے انہیں اپنے دفاع کی ضرورت نہیں تھی۔ جبکہ بعض مسلمان جو عسکریت پسندوں کے مخالف تھے انہوں نے ان کمیٹیوں میں شمولیت اس لیے قبول نہ کی اس سے عسکریت پسند ان سے ناراض ہو جائیں گے اور ایسا کرنے پر وہ جلد یا بدیر انہیں قتل کر ڈالیں گے۔''

ڈوڈہ کا گل محمد کسی حد تک اس سے اتفاق کرتا ہے مگر کہتا ہے ''ڈوڈہ میں عسکریت پسندوں کے ہاتھوں مسلمان، ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں قتل ہوئے ہیں، ان پر بھارت کے مخبر یا اس کے حامی ہونے، حتیٰ کہ جبری بھتہ وصولی کے مزاحمت کار ہونے کا الزام بھی لگتا ہے۔ چنانچہ مسلمان بھی ان کمیٹیوں میں شامل ہونے کے مستحق ہیں۔ ہمیں کافی تعداد میں ان میں شمولیت کا موقع نہ دینے سے حکومت صرف اپنے مسلم دشمن کردار کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ بعض کیسوں میں وہ مسلمان جو عسکریت پسندوں کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے ہیں وہ تحفظ کمیٹیوں میں شمولیت کے لیے درخواست دینے سے اس لیے بھی ڈرتے ہیں کہ اگر انہوں نے حکام سے اسلحہ قبول کیا اور وہ عسکریت پسندوں نے چھین لیا تو ان پر یہ الزام تھوپ دیا جائے گا کہ وہ اُن لوگوں کے ساتھ درپردہ ملے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انہیں دونوں طرف سے مار کھانا پڑے گی۔ عسکریت پسندوں سے بھی اور مسلح افواج سے بھی۔''

اس ماہ مئی کے اوائل میں کلہند میں متعدد ہندوؤں کے قتل عام کے بعد ڈوڈہ کے قریب ایک دورافتادہ بستی میں بی جے پی نے ''ڈوڈہ بچاؤ'' کے نام سے ایک مہم چلائی اور اس موقع پر اس نے جو مطالبات پیش کئے ان میں سے سب سے بڑا یہ تھا کہ ڈوڈہ میں عسکریت پر قابو پانے کے لیے تحفظ کمیٹیوں کو مزید طاقتور بنایا جائے، ان کی تعداد بڑھائی جائے، ان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے اور انہیں زیادہ جدید ہتھیار فراہم کئے جائیں۔ بی جے پی کے لیڈر اس حد تک بھی چلے گئے کہ انہوں نے جموں و کشمیر کو موجودہ گجرات گورنمنٹ کے حوالے کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ جس کا سربراہ بدنام قاتل نریندر مودی تھا غالباً مقصد موجودہ جاری کشمکش کا ''آخری حل'' تھا، یا وہ تھا جس کی ''کشمیر ٹائمز'' نے اپنے اداریئے میں بجا طور پر مذمت کی تھی کہ یہ ''جموں و کشمیر کے لیے وہ مکروہ ہندوتوا منصوبہ ہے

جس میں گجرات والے کشت وخون کا اعادہ مطلوب ہے۔'' سینئر بی جے پی لیڈر اور سابق چیف منسٹر دہلی صاحب سنگھ ورما نے جموں وکشمیر میں ''ڈوڈہ بچاؤ'' مہم کے دوران یہ اعلان کر کے ایک اور بڑا طوفان مچا دیا کہ ہر سویلین کو جو ایک ''عسکریت پسند'' کو گولی مار کر ہلاک کرے گا ایک لاکھ روپے انعام دیا جائے گا۔ اس اعلان پر شدید احتجاج کیا گیا کیونکہ جیسا کہ اس کی نشاندہی کی گئی کہ اس کا مطلب ہندوؤں کو کھلی چھٹی دینا ہے کہ وہ کسی مسلمان کو مار دے اور پھر مرنے والے پر عسکریت پسند ہونے کی چھاپ لگا دے۔ اس پر شور مچا تو بی جے پی کے لیڈروں نے بعجلت یہ اعلان کر دیا کہ یہ انعام صرف تحفظ کمیٹیوں کے ارکان کے لیے رکھا گیا ہے کہ وہ ایسا کریں۔ مگر اس سے بی جے پی کے مخالفین کو ٹھنڈا نہ کیا جا سکا جنہوں نے بجا طور پر اعلان کو اس حقیقت کی ایک اور گواہی قرار دیا کہ تحفظ کمیٹیاں ڈوڈہ میں بین المذاہب تعلقات کو مزید پیچیدہ بنانے کا ایک اور بڑا فیکٹر بن چکی ہیں۔ یہ بی جے پی کے ہندوتوا ایجنڈے کو آگے بڑھانے کی سرتوڑ کوششوں کا حصہ ہے۔

کشتواڑ کے ایک منجھے ہوئے سیاستدان کا کہنا ہے کہ ''تحفظ کمیٹیاں بی جے پی اور آر ایس ایس کی ذہنی کاوشوں کی پیداوار تھیں، ان کے اولین ارکان میں سے بیشتر سابق فوجی ملازمین ہوا کرتے تھے اور ان میں سے تقریباً سب ہندو تھے انہیں اُس وقت بھی بی جے پی کی پُر جوش پشت پناہی حاصل تھی اور اب بھی ہے۔ اور ان میں سے زیادہ تر بی جے پی کے ہمدرد اور ہمنوا ہیں۔ الیکشن کے وقت ان میں سے بہت سے بی جے پی کے لیے کنوینگ کرتے ہیں، حتیٰ کہ پارٹی کے پولنگ ایجنٹ بھی بن جاتے ہیں۔ چنانچہ تحفظ کمیٹیوں والے بی جے پی کے آلۂ کار ہیں اور ڈوڈہ میں اس کے مفادات کی نگرانی کرتے ہیں۔ جب حال میں بی جے پی نے ہر سویلین کے لیے ایک لاکھ روپے انعام کا اعلان کیا، بعد ازاں ہر عسکریت پسند کے قتل پر ''ہر سویلین'' کے لفظ کو ''ہر رکن تحفظ کمیٹی'' سے تبدیل کیا، اس سے بی جے پی کے مسلم دشمن رویّے میں مزید شدت آ گئی۔ اب کسی رکنِ تحفظ کمیٹی کو کسی مسلمان کے قتل سے کون روک سکے گا۔ اس کی گولی کا نشانہ ہر وہ مسلمان بن سکتا ہے جس سے اسے ذاتی انتقام لینا ہو (خواہ وہ عسکریت پسند نہ بھی ہو) پھر وہ اسے عسکریت پسند ظاہر کر کے بھاری انعام ہتھیا لے گا۔

اس شخص کی دلیل کافی معقول دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے حال میں ڈوڈہ کے پار ہندو اکثریت کے قصبات اور دیہات میں مقامی بی جے پی کے کارکنوں کی طرف سے درودیوار پر چسپاں پوسٹر دیکھے جن پر ڈوڈہ کو فوج کے حوالے کرنے، تحفظ کمیٹیوں کو جدید ترین اسلحہ دینے اور ان کے ارکان کی تنخواہیں بڑھانے کے مطالبے لکھے ہوئے تھے۔ بی جے پی تحفظ کمیٹیوں کا ''کارڈ'' استعمال کر کے اپنے آپ کو واضح طور پر ڈوڈہ کے ہندوؤں کی نجات دہندہ'' بن کر سامنے آنا چاہتی ہے، خواہ اس کے نتیجے میں اسے ضلع بھر کے مسلمانوں کی کتنی ہی زیادہ دشمنی کیوں نہ مول لینی پڑے۔ کیونکہ وہ جس طرح ان کمیٹیوں کو استعمال کرنا چاہتی ہے وہ انہیں صرف عسکریت پسندوں کے خلاف ہی متحرک نہیں دیکھنا چاہتی بلکہ ایک مفہوم میں انہیں سب مسلمانوں کے ساتھ حالتِ تصادم میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اس سے مسلمانوں کی یہ دلیل وزنی نظر آتی ہے کہ اگر بی جے پی ان کمیٹیوں کو اپنے اینٹی مسلم ایجنڈے کی ہمنوا بنانے میں پوری طرح کامیاب ہوگئی تو پھر ان کے ہاتھ سے مسلمانوں کو ہرگز محفوظ نہیں رکھا جا سکے گا۔

بہت سے دیہاتی مسلمان تحفظ کمیٹیوں کے معاملے میں ریاستی رویئے کو ''دوہرے معیار'' کا مظاہرہ قرار دیتے ہیں۔ گندوہ کے ایک مسلمان نے کہا ''گجرات میں ریاست کی زیر پرستی ہندوتوا کی مسلم دشمنی اور کشت وخون کی منظم منصوبہ بندی کے تحت ایک ہفتے سے کم عرصے میں مزید تین ہزار مسلمان ہلاک اور لاکھوں بے گھر کر دیئے گئے، تو پھر ریاست نے مسلمانوں کے لیے کیا کیا؟ ان کی مدد تو رہی درکنار وہ ہر وہ کام کرتی رہی ہے اور کر رہی ہے جس سے مسلمان کچلے جائیں۔ اس کے برعکس ڈوڈہ میں عسکریت پسندوں کے ہاتھوں پندرہ برسوں میں جو ہندو مارے گئے وہ گجرات میں قتل ہونے والے مسلمانوں کی تعداد کا تقریباً دسواں حصہ تھے۔ لیکن ریاست اپنے دائرے سے تجاوز کرتے ہوئے ہندوؤں کو تحفظ کمیٹیوں کے ذریعے مسلح کر رہی ہے۔ اگر بھارت واقعی سیکولر اور جمہوری ملک ہے، جیسا کہ وہ دنیا کے سامنے اعلان کرتا پھرتا ہے تو وہ گجرات میں مسلم تحفظ کمیٹیوں کے قیام کو کیوں مناسب نہیں سمجھتا؟

اس نے مزید کہا ''یہ درست ہے کہ اقلیتیں جہاں کہیں بھی ہوں وہ عموماً خود کو غیر محفوظ

سمجھتی ہیں لیکن ریاست کو ان سے مساویانہ سلوک کرنا چاہیے۔ میں مانتا ہوں کہ ڈوڈہ میں ہندو یقیناً خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں، ریاست کو انہیں عسکریت پسندوں سے محفوظ رکھنا چاہیے مگر اس نے ایسے ہی اقدامات گجرات کے مسلمانوں کے لیے کیوں نہیں کئے؟ گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ ریاست اور ہندوؤں کا قبیح سلوک دیکھتے ہوئے بہت سے مسلمان پوچھ رہے ہیں کہ ہم ایسے ملک میں کیوں رہیں جس میں مسلمانوں کی زندگیوں کی کوئی قیمت نہیں؟ اگر بھارت کشمیریوں کے دل جیتنا چاہتا ہے تو اسے ہندو فاشزم کو لگام دینا ہوگی نہ کہ تحفظ کمیٹیوں جیسی سکیموں کے ذریعہ صرف ہندوؤں کو خوش کرتا رہے۔ بی جے پی ان کمیٹیوں کو ہائی جیک کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ حکومت کو ہندو اور مسلم انتہا پسندوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیے اور دونوں کے خلاف یکساں طریقے سے کاروائی کرنی چاہیے لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو رہا ہے۔''

کلہند میں ایک درجن سے زائد بدقسمت ہندوؤں کو وحشیانہ طریقے سے قتل کیا گیا تو حکومت نے فوری اقدام کرتے ہوئے کلہند کے اردگرد کے علاقے میں 85 نئی تحفظ کمیٹیاں قائم کر دیں اور ہتھیاروں سے صرف ہندوؤں ہی کو نوازا۔ ہندوؤں نے اس کا خیر مقدم کیا اور مسلمانوں نے اس کو ہندوؤں کی حفاظتی ضرورت تو جانا مگر ساتھ اس خدشے کا اظہار بھی کیا کہ یہ اسلحہ صرف عسکریت پسندوں کے خلاف ہی نہیں ایک دن عام مسلمانوں کے خلاف بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ جب تک بی جے پی کو اس کے غلط استعمال سے باز رکھنے کا کوئی انتظام نہ ہو، یہ خدشہ اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ قتل عام کے واقعے کے بعد جلد ہی میں نے دور افتادہ دیہات کے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو ڈوڈہ ٹاؤن میں گورنمنٹ آفس کے باہر اکٹھے ہوتے دیکھا جس کے اندر تحفظ کمیٹیوں کے لیے دی گئی درخواستوں پر کاروائی ہو رہی تھی۔ وہ اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ ان کے اپنے دیہات میں ایسی کمیٹیوں کے قیام سے کیوں انکار کیا جا رہا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ کلہند میں قتل عام کے فوراً بعد ڈوڈہ سے کشتواڑ جانے والے راستے پر پریم نگر کے قریب واقع گاؤں کے صرف ایک آٹھ رکنی گروپ کی طرف سے تحفظ کمیٹی کے قیام کی درخواست منظور کی گئی ہے، شاید ایسا کوئی اور کیس بھی ہو، تاہم مجموعی طور پر اس سکیم سے مستفید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔

MashalBooks.org

کلہند کے قریب کے ایک گاؤں کے ایک مسلمان نے، جس کی درخواست برائے قیام تحفظ کمیٹی مسترد کر دی گئی ہے، بتایا کہ ''چونکہ ہم مسلمان ہیں اس لیے حکومت ہم پر شبہ کرتی ہے کہ ہم ان ہتھیاروں کو عسکریت پسندوں کے حوالے کر دیں گے، اس سے قبل کلہند سمیت متعدد ہندو مسلم مشترک دیہات کی تحفظ کمیٹیوں کے قیام کے لیے درخواستیں مسترد کی جا چکی ہیں۔ ان مضافات کے باشندے محسوس کرتے ہیں کہ اس سے فرقہ وارانہ تقسیم بڑھ جانے کا خدشہ ہے اور صدیوں پرانی ہم آہنگی ٹکڑوں میں بٹ جائے گی کیونکہ یہ کمیٹیاں فرقہ وارانہ خطوط پر قائم کی جا رہی ہیں۔ اور اس وجہ سے بھی کہ کسی گاؤں میں کمیٹی کا قیام عسکریت پسندوں کو مشتعل کرنے کا سبب بن جاتا ہے'' اس نے کہا کہ ''لیکن اب حالات بدل رہے ہیں، ہندو مسلمان دونوں ہی اپنے اپنے گاؤں میں ان کمیٹیوں کا قیام چاہتے ہیں۔''

بھلیسا کے ایک مسلمان دکاندار کا کہنا ہے کہ ''تحفظ کمیٹیوں کے ذریعے ریاست کے ہندوؤں کو مسلح کرنے پر اب بہت سے مسلمان بھی مطالبہ کرنے لگے ہیں کہ ان کے ہاں بھی ایسی کمیٹیاں قائم کر دی جائیں، ممکن ہے کہ اس کا عسکریت پسندوں کے خوف سے زیادہ تعلق نہ ہو، اس کا زیادہ تعلق تحفظ کمیٹیوں ''والے'' ہندوؤں سے ہو، کیونکہ اگر ہندوتوا فورسز کو من مانیاں کرنے کی اجازت مل گئی تو ایک دن آ سکتا ہے کہ وہ ان تحفظ کمیٹیوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے پر آ جائیں، عسکریت پسندوں کے حملوں کے جواب میں ہندو بوجہ نفرت یا بطور ردّ عمل مسلمانوں پر حملے شروع کر دیں۔ ڈوڈہ کے ایک مسلمان سماجی کارکن نے کہا کہ ''بی جے پی اور انتظامیہ نے تحفظ کمیٹیوں کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا ہے، کلہند قتل عام کے بعد یہ مسئلہ بطور خاص ایک بڑے تنازعے کی شکل اختیار کر گیا ہے، جس نے فرقہ وارانہ تقسیم کی آگ کو ایندھن فراہم کر دیا ہے۔ اس سے صرف متعصب ہندوؤں اور مسلم عسکریت پسندوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، یہ سوڈا واٹر کی بوتل کی طرح ہے جونہی اسے کھولا گیا سارا لاوا پھٹ کر باہر آ جائے گا۔''

بی جے پی تحفظ کمیٹیوں اور ان کے نیٹ ورک کو جس طرح وسعت دے رہی ہے اور ان کی آڑ میں جو صف بندیاں کر رہی ہے خدشہ ہے کہ کسی دن سول وار پھوٹ پڑے گی جس میں ایک طرف اسلام پسند ہوں گے اور دوسری جانب تحفظ کمیٹیاں ہندوتوا بریگیڈ کے

طور پر کھڑی ہو جائیں گی۔ ڈوڈہ میں میرا جتنے لوگوں سے تبادلۂ خیال ہوا ان سب نے اسی خدشے کا اظہار کیا۔ اس سے علاقے میں فرقہ وارانہ تعلقات پر تباہ کن اثرات پڑیں گے جن سے متعصب مسلمانوں اور متعصب ہندوؤں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے۔

یہ خدشات مکمل طور پر بے بنیاد نہیں ہیں، کلہند کی قتل و غارت کے فوراً بعد ایک گاؤں میں، جس میں سب سے پہلے ''ہندو تحفظ کمیٹی'' قائم ہوئی تھی، مجھے بتایا گیا کہ ہندو چھوکروں نے بی بے پی کے نعرے لگاتے ہوئے، (جیسا کہ میرے ترجمان نے مجھے بتایا) مسلمانوں کے واحد گھر پر فائرنگ کر دی تا کہ اس کے باسیوں کو خوفزدہ کیا جا سکے۔ چند دن بعد جب میں گندوہ ''تحصیل'' گیا تو وہاں مجھے بتایا گیا کہ تحفظ کمیٹی کے ایک ہندو ممبر نے ایک بے گناہ مسلم نوجوان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا، جس کا سبب یہ تھا کہ ایک عسکریت پسند شخص نے سپیشل پولیس افسر (SPO) سے اس کی گن چھین لی تھی، اس کا انتقام اس نوجوان کو قتل کر کے لیا گیا۔ یہ پولیس افسر ایک مقامی بی جے پی رہنما کے ساتھ ڈیوٹی دیتا تھا۔ میں نے تحفظ کمیٹی کے کئی ممبروں کے بارے میں اس طرح کی کہانیاں سنی ہیں (جن میں تصدیق نہیں کر سکا) کہ وہ مسلمانوں پر عسکریت پسندی کے جھوٹے الزامات لگا کر آرمی کو رپورٹ کر دیتے ہیں۔

ڈوڈہ میں میری کئی مسلمانوں اور متعدد ہندوؤں سے ملاقاتیں ہوئیں ان سب نے تقریباً اسی رائے کا اظہار کیا کہ تحفظ کمیٹیوں کی جس انداز میں تشکیل ہوئی ہے یہ ''زد پذیر'' دیہاتیوں کی حفاظت کا بہترین طریقہ نہیں ہیں۔ کلہند کے قریب واقع ایک بستی کا ایک ہندو باسی کہتا ہے ''تحفظ کمیٹیوں کی فرقہ وارانہ خطوط پر تشکیل کے بجائے یہ مشترکہ ہونی چاہیے تھیں جن میں ایسے مسلمان اور ہندو ارکان ہوتے جنہیں ان کے گاؤں کے تمام لوگوں کا اعتماد حاصل ہوتا لیکن حکومت اس وقت جس طریقے سے ہتھیار بانٹ رہی ہے، اس سے تحفظ کمیٹیوں کے نام پر سارا اسلحہ ہندوؤں کے پاس اکٹھا ہو رہا ہے، اس پر ہمارے بہت سے مسلمان ہمسائے سخت پریشان اور خوفزدہ ہیں۔ اگر حکومت ان کمیٹیوں کو جاری رکھنا چاہتی ہے تو کم از کم اسے جو کچھ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ اس امر کی ضمانت حاصل کرے کہ ان کے ارکان قابل بھروسہ لوگ ہیں جن کا ہندو اور مسلمان احترام کرتے ہیں اور انہیں

یقین ہو کہ یہ اپنے ہتھیاروں کو غلط استعمال نہیں کریں گے لیکن اب صورت حال ایسی نہیں ہے۔

اسی طرح اسی گاؤں کے ایک کالج سٹوڈنٹ نے مجھے بتایا کہ ایک آئیڈیل بات تو یہ ہے کہ سیکورٹی فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اسے اپنی یہ ذمہ داری سویلینز کو ٹھیکے پر دے دینے کا سلسلہ بند کر دینا چاہیے۔ سیکورٹی کا بوجھ عام لوگوں کے کمزور کندھوں پر منتقل کرنا بہت غلط بات ہے۔ عسکریت پسندوں اور فوج کو آپس میں لڑنے دیجئے۔ غریب سویلنز کو اس کام کے لیے کیوں استعمال کیا جائے۔ یہ تو وہی حرکت ہے جو غیر ملکی کمپنیاں ''کال سنٹرز'' کے ذریعے کر رہی ہیں اور اپنے بے پناہ منافع کے لیے بھارت کی سستی لیبر کو استعمال کر رہی ہیں۔ سیکورٹی کا کام پولیس یا آرمی کے سپرد کرو جو کم از کم کسی قاعدے قانون کی تابع تو ہیں، یہ ان غنڈوں بدمعاشوں کی طرح نہیں ہیں جن میں سے بعض تحفظ کمیٹیوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ اگر حکومت پولیس مینوں اور فوجیوں کو ہر دور افتادہ گاؤں میں متعین کرنے کی لاگت برداشت نہیں کر سکتی تو وہاں کی تحفظ کمیٹیوں میں ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب کے لوگ ہونے چاہئیں اور وہ سب ایک ذمہ دار پولیس آفیسر کی کمانڈ اور کنٹرول کے ماتحت ہوں، ان میں ربط و ضبط ایک مقامی لوگوں کی ٹیم قائم کرے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہوں ان کمیٹیوں کو پورے گاؤں کا اعتماد حاصل ہو صرف ایک کمیونٹی پر مشتمل کمیٹی نہیں ہونی چاہیے۔

بھدرواہ کے ایک ادھیڑ عمر شخص، جس کا اصرار ہے کہ وہ نہ ہندو ہے اور نہ مسلمان، بلکہ ایک عام فانی انسان ہے، اس نے کہا کہ ''میں کسی لگی لپٹی کے بغیر بات کرنے والا آدمی ہوں، میں کم سے کم، ان کمیٹیوں کے بارے میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ ساخت کے مطابق یہ زیادہ دیر چلنے والی نہیں ہیں کیونکہ بی جے پی انہیں اپنی راہ پر ڈالنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ یہ فرقہ واریت کی آگ پر تیل چھڑک رہی ہے۔ اس نے مسائل کو مزید گمبھیر کر دیا ہے یہ پرابلم کا حصہ ہیں، ان کے حل کا حصہ نہیں ہیں۔ ان کی ازسرنو تشکیل ہونی چاہیے تاکہ یہ فرقہ واریت کی بجائے جامعیت کی علمبردار ہوں۔'' اس نے بعجلت اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ یہ ''شارٹ ٹرم اقدامات ہیں خالص اور دیرپا امن فوجی ذرائع سے

وجود میں نہیں آسکتا۔ اس کے لیے ہمیں ایک سیاسی حل کی ضرورت ہے جو تنازعہ کشمیر کے تمام فریقوں کو مطمئن کرسکتا ہو۔ ہمیں ہندو اور مسلم انتہا پسندوں کے خلاف مل کر کام کرنا ہوگا، ان لوگوں کے دل خدا اور انسانیت کی محبت سے خالی ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ''میں اسّی سال کا بوڑھا آدمی ہوں اور تیزی سے موت کی وادی کی طرف لڑھک رہا ہوں، مجھے ڈر ہے کہ میں اپنی زندگی میں حالت کو سدھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔'' اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے امن کے لیے دعا کی، میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا کیونکہ میں ایک معمر آدمی کو روتے دیکھنے کا متحمل نہیں ہو رہا تھا۔

[جولائی، ستمبر2006]

MashalBooks.org

بی جے پی کی ''ڈوڈہ بچاؤ'' مہم

ڈوڈہ میں تقریباً دو درجن ہندوؤں کے نامعلوم گن مینوں کے ہاتھوں بہیمانہ قتل کے بعد گلاب گڑھ، ادھم پور ڈسٹرکٹ جموں ڈویژن میں اس سال مئی کے اوائل میں ہونے والے دہشت ناک قتل کے بعد بی جے پی نے انڈیا بھر میں ''ڈوڈہ بچاؤ'' مہم چلا دی۔ ڈوڈہ، ہندوؤں اور مسلمانوں کی برابر برابر آبادی کا گھر ہے۔ بی جے پی کے ترجمانوں کا دعویٰ ہے کہ کشمیری عسکریت پسندوں اور ان کے پاکستانی پشتی بانوں نے ڈوڈہ کو ہندوؤں کی نسلی جھاڑ پونچھ کے تازہ ترین اکھاڑے کے طور پر منتخب کیا تھا۔ جیسا کہ کشمیری پنڈتوں کو وادیٔ کشمیر سے فرار ہونے پر مجبور کیا گیا تھا، اب ڈوڈہ کے ہندوؤں کو کشت و خون اور ڈرانے دھمکانے کی ایک منظم مہم کے ذریعے ان کے آبائی گھروں سے نکالا جا رہا ہے۔

کلہند کے قتل عام کے فوراً بعد ڈوڈہ میں چُن چُن کر ہندوؤں کے کشت و خون کرنے کا یہ 16واں ایسا واقعہ تھا جو 1990 سے شروع ہونے والے دہشت گردی کے واقعات کی کڑی تھی۔ بی جے پی کے لیڈرز بشمول پارٹی پریذیڈنٹ رجناتھ سنگھ اور لوک سبھا میں لیڈر آف اپوزیشن ایل کے ایڈوانی ڈوڈہ ٹاؤن میں پہنچے تاکہ اس بے حد شہرت پانے والی ''ڈوڈہ بچاؤ'' مہم کا آغاز کیا جا سکے۔ انہوں نے خود کو ڈوڈہ کے ہندوؤں کے نجات دہندہ کے طور پر پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اس ضلع کو فوج کے حوالے کیا جائے، عسکریت پسندوں کے خلاف گورنمنٹ آف انڈیا کی ''نرم'' پالیساں فوراً ختم کی جائیں اور یہ کہ دیہی تحفظ کمیٹیوں (VDCs) کو جو ہندو نوجوانوں پر مشتمل ہوں جدید ترین ہتھیار دے کر مضبوط کیا جائے۔

''ڈوڈہ بچاؤ'' مہم ڈوڈہ تک یا صرف جموں و کشمیر تک محدود نہیں رہی بلکہ بی جے پی نے اپنے منصوبے کے مطابق اسے ملک بھر کی مہم بنا دیا۔ اس کے ذریعے اس نے اپنے اس

دعوے کی بنیاد رکھی کہ وہ جموں وکشمیر کے تمام کے تمام ہندوؤں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر پورے بھارت کے ہندوؤں کی بحیثیت مجموعی ذمہ دار ہے، اس نے خود کو ان کی واحد ترجمان اور انتہائی سرگرم محافظ کی حیثیت سے پیش کیا اور اس مہم کو اس دعوے کے طور پر استعمال کیا کہ ڈوڈہ کے ہندوؤں کے لیے صرف وہ فکرمند ہے اور یہ کہ دوسری تمام جماعتیں اپنے اپنے انداز میں کشمیر کے اندر عسکریت پسندوں کی سازشوں میں شریک اور ان کی ہمنوا ہیں۔ ایک واضح تاثر جو اس نے بڑی ہوشیاری سے ابھارا، یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہبی تضاد یا ان کا قطبین کی طرح ایک دوسرے کی ضد ہونا (communal polarisation) ڈوڈہ میں مکمل ہو چکا ہے، یہ کہ ضلع بھر کے مسلمان، عسکریت پسندوں کے ساتھ ہیں اور ان کا ایجنڈا ضلعے کو اس کے ہندو باشندوں سے خالی کرانا ہے، یہ کہ اب صرف وقت کا مسئلہ باقی رہ گیا ہے، اگر حکومت اور فوج نے عسکریت پسندوں اور ان کے ہمدردوں کے خلاف سخت کاروائی نہ کی اور ہندوؤں کو تحفظ نہ دیا تو ڈوڈہ کے ہندو اپنے گھر بار چھوڑ کر فرار ہو جائیں گے۔

ان دعووں میں سے بعضوں میں سچ کا ایک عنصر تو واقعی پایا جاتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے دوڈہ میں حالیہ تین ہفتوں کے قیام کے دوران پایا، دیگر آدھی سچائیوں کی طرح یہ بیان مکمل تصویر پیش نہیں کرتا اور اسے ایسی پالیسیوں کی وکالت کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے جو کشمیر میں فروغِ امن میں مدد دینے کی بجائے کشمکش کو اور بھی زیادہ بے قابو بنا دیتی ہیں۔ یہ بھی کافی حد تک سچ ہے کہ ڈودہ کے بعض حصوں، بالخصوص اونچے اونچے پہاڑوں میں واقع دُور افتادہ دیہات کے ہندو واقعی خود کو بے حد غیر محفوظ پاتے ہیں۔ خاص طور پر کلہند کے قتل عام کے بعد وہ زیادہ عدم تحفظ محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن یہ دلیل کہ ڈوڈہ اپنی ہندو آبادی سے بالکل خالی ہونے والا ہے اور وہاں ضلعے اور دور دراز مقامات پر مکمل مذہبی تقطیب ہے، دور از کار باتیں ہیں۔ اور اسی طرح کی بات یہ ہے کہ اگر حکومت نے بی جے پی کے مطالبات پورے نہ کئے، جو کہ اسے ضرور پورے کرنے چاہئیں تو یہ پیشینگوئیاں ازخود پوری ہونے لگیں گی۔

کلہند کے قتل عام کے بعد کہا جاتا ہے کہ 150 ہندو خاندان کلہند اور اس کے قریبی

مضافات سے فرار ہو کر ڈوڈہ ٹاؤن، ادھم پور اور جموں میں جا کر آباد ہو گئے ہیں جبکہ بہت ہی کم لوگوں نے ایسا کیا تھا۔ جب میں کلہند گیا چند ہندو خاندان خوف کی وجہ سے وہاں سے چلے جانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور باقی بہت سے لوگوں نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جیسا کہ ایک مارے جانے نوجوان کے والد نے مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ''ہم یہیں پیدا ہوئے اور یہیں مریں گے ہم اپنی زمینوں اور مویشیوں کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ جائیں کہاں؟ ہم بھاگ گئے تو ہماری دیکھ بھال کون کرے گا؟ کیا جموں کے وہ بنیئے کریں گے جو بی جے پی کی پشت پناہی کر رہے ہیں؟ بالکل نہیں۔ اگر ہم وہاں پہنچ گئے تو ہم جموں کی گلیوں میں بھٹکنے والے گداگر بن جائیں گے۔''

گاؤں کے ایک اور ہندو نوجوان طالب علم نے مجھے بتایا ''بی جے پی کی 'ڈوڈہ بچاؤ' مہم درحقیقت ہمارے لیے حالات کو مزید غیر محفوظ بنا رہی ہے، بی جے پی والے جو قتل عام کے بعد ڈوڈہ میں آئے، یہ بڑے بڑے نیتا، تقریباً سب کے سب باہر کے لوگ ہیں، کوئی ادھم پور کا ہے کوئی بٹوٹ، جموں اور دہلی کا، انہیں ہمارے لیے کوئی پریشانی نہیں، انہوں نے ہمیں ایک ہفتے کا راشن دیا تھا اور بس فارغ ہو گئے تھے انہوں نے ہمیں بھلا دیا ہے۔ ہمیں ٹیلی ویژن کیمروں کے سامنے اور پریس کی کوریج کے لیے استعمال کیا ہے اور ان کے ذریعے دنیا کے سامنے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہیں ڈوڈہ کے ہندوؤں کے بارے میں بہت پریشانی ہے، مگر یہ ان کے لیے محض ایک سیاسی کارنامہ ہے، انہوں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔''

اس طالب علم کے بھائی نے اسے روکا اور کہا ''یہ لوگ یہاں آ کر مسلمانوں کے خلاف ہمارے جذبات ابھارتے ہیں اور حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ عسکریت پسندوں کے خلاف سخت اقدامات کرے، پھر وہ کاروائی کرنے لگتی ہے تو بے گناہ مسلم سویلینز کو نشانہ بناتی ہے۔ اس سے ردّعمل بھی پیدا ہوتا ہے کیونکہ زد میں صرف عسکریت پسند ہی نہیں آتے عام مسلمان بھی پستے ہیں، جن کے ساتھ ہمارے صدیوں سے خیرسگالی کے تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ ان لوگوں کا عسکریت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا، پھر وہ لامحالہ ہمارے مخالف بن جاتے ہیں۔ بی جے پی کی مُہم صرف ان عسکری گروپوں کے ہاتھ مضبوط

کرسکتی ہے جو ہندوؤں کو ڈوڈہ سے نکالنا چاہتے ہیں۔

ڈوڈہ کے دوسرے مقامات مثلاً گندوہ، بھدواہ، تھتھری اور ڈوڈہ کشتواڑ کی تحصیلوں میں، جہاں جہاں میں اس دورے کے دوران گیا مجھے کاہند کے واقعہ کے بعد ہندوؤں کی ترک سکونت کے کسی نمایاں واقعے کا پتہ نہیں چلا۔ ہندو اور مسلمان اپنی زندگیاں عام معمول کے مطابق گزار رہے ہیں یعنی جموں و کشمیر میں عرصے سے چلی آ رہی چپقلش کا جتنا ممکنہ اثر ہوسکتا ہے مجھے اس سے زیادہ کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ بھارت کے بہت سے دوسرے حصوں کے برعکس ڈوڈہ کے بیشتر مقامات پر ہندو اور مسلمان مناقشت زدہ علیحدگی کی حالت میں نہیں رہتے۔ بازاروں میں ان کی دکانیں ساتھ ساتھ ہیں۔ بیشتر صورتوں میں ان کے بچے مشترکہ سکولوں اور کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔ اگرچہ ڈودہ کے کئی ہندو پچھلے واقعات کی وجہ سے کسی حد تک خوف محسوس کرتے ہیں لیکن مسلمان بھی کئی جگہوں پر خوفزدہ پائے جاتے ہیں جنہیں ہندوؤں کے برعکس عسکریت پسندوں اور فوج، دونوں کی کاروائیوں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ عسکریت پسندوں نے ڈوڈہ اور وادیٔ کشمیر میں جتنے سویلین افراد کو قتل کیا ان میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس حقیقت کو آسانی سے فراموش کر دیا گیا ہے۔ اس کا ہندو تو میں (اور اسلام پسندوں میں بھی) تنازعہ کشمیر سے متعلقہ گفتگو میں کبھی ذکر نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگ صرف ''ہندو بمقابلہ مسلمان'' کشمکش کا ذکر کرتے ہیں۔

میں ڈوڈہ کے اس تازہ ترین دورے کے موقع پر جتنے ہندوؤں سے ملا ان میں سے تقریباً سارے اپنے گھر بار چھوڑنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنا رہے تھے جو بی جے پی کے دعوؤں سے بالکل برعکس صورتِ حال تھی۔ بھدرواہ کی کوتوال برادری کے ایک معمر شخص نے کہا ''ہم راجپوت ہیں اور کشمیری پنڈتوں کے برعکس اگر کوئی ایسی ناخوشگوار صورت حال پیدا ہوگئی تو ہم بھاگنے کی بجائے لڑیں گے اور مریں گے۔'' اسی نقطے کو مختلف دلیل کے ساتھ پیش کرنے والے بھی موجود ہیں۔ کشتواڑ کے ایک ہندو دکاندار نے بتایا ''میں کشتواڑ کو نہیں چھوڑ رہا ہوں، میرے بہت سے مسلمان دوست ہیں، عسکریت پسند جو کچھ کر رہے ہیں وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ بے گناہ لوگوں کو قتل کرنا غلط ہے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ تمام مسلمان عسکریت پسندوں کے ہمدرد نہیں ہیں۔ ہم ان دونوں کے مابین فرق

کر سکتے ہیں لیکن بی جے پی سب مسلمانوں پر عسکریت پسندوں کے حامی ہونے کی چھاپ لگا دیتی ہے۔ اس طرح وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ہمارے صدیوں پر پھیلے ہوئے باہمی تعلقات ایسے نہیں ہیں۔ ایڈوانی یہاں آتا ہے اور زہر اگل کر چلا جاتا ہے۔ ہم ہندو یہاں بی جے پی کی فرقہ وارانہ سیاست کے تباہ کن نتائج بھگتتے رہتے ہیں اُس کو امن اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مسلم عسکریت پسندوں کی طرح بی جے پی بھی فرقہ وارانہ منافرت کو وسعت دینا چاہتی ہے اور ہماری نجات دہندہ کا روپ دھار کر سیاست بازی کر رہی ہے۔''

ہوسکتا ہے کہ چند کشمیری اور غیر ملکی عسکریت پسند ڈوڈہ کو اس کی تمام ہندو آبادی سے محروم کرنا چاہتے ہوں اور ان کی خواہش ہو کہ ان کے ''دارالاسلام'' کے قیام کے خواب کی جلد از جلد تعبیر مل جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ڈوڈہ کے چند مسلمان چاہتے ہوں کہ اس ضلعے کے ہندو یہاں سے چلے جائیں۔ تاہم وہ ہندوتوا کے بے شمار حامیوں سے بمشکل ہی مختلف ہو سکتے ہیں جن کی خواہش ہو گی کہ بھارت کے لاکھوں مسلمان ایک ساتھ یہاں سے پاکستان ہجرت کر جائیں۔ یا دُور سرزمینِ عرب میں جا بسیں۔ تاہم بی جے پی کی یہ دلیل کہ ڈوڈا کے سب یا بیشتر مسلمان چاہتے ہیں کہ ضلعے کو ہندوؤں سے خالی کرا لیا جائے، مکمل طور پر مغالطے پر مبنی ہے۔ یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی اکثریت اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی کہ وہ آبرومندانہ طریقے سے زندگی گزارے اور ان کی روزانہ کی جہد للبقا کامیاب اور پُرامن رہے کیونکہ وہ خطّے میں سال ہا سال سے جاری کشمکش سے تنگ آ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ڈودہ میں جتنے مسلمانوں سے ملا ان کی اکثریت اور حتیٰ کہ وہ بھی جو یقینی طور پر حامیانِ خودمختاری یا حامیانِ پاکستان ہیں (مؤخر الذکر سکڑتی ہوئی اقلیت ہیں) بہ اصرار کہتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے ڈوڈہ سے انخلا کے مخالف ہیں اور بی جے پی پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ دراصل ہندوؤں کے ''تحفظ'' کے نام پر انہیں یہاں سے نکلوانے کے منصوبے پر عمل کر رہی ہے۔ ان میں بعض اسے سابق گورنر کشمیر جگموہن کی ہندوتوا کی تیار کردہ سازش کے مشابہ قرار دیتے ہیں جس کے تحت پنڈتوں کو کشمیر سے نکلوا کر کشمیریوں کی جدوجہد کو غلط طور پر ''فرقہ وارانہ'' یا قدامت پسندانہ رنگ دیا گیا ہے۔

ڈوڈہ کے ایک قریبی گاؤں کے ایک ''ہندو سرپنچ'' نے کہا کہ ''تمام کے تمام عسکریت پسند لازمی طور پر ہندو دشمن نہیں ہیں، اگرچہ لشکر طیبہ جیسے بنیاد پرست گروپوں سے وابستہ لوگ یقیناً ایسے ہی ہیں۔'' اس نے مزید کہا کہ مقامی اور کشمیری عسکریت پسند پاکستانی اور افغانی عسکریت پسندوں کی بہ نسبت زیادہ فراخ دل ہیں اور ہندوؤں کو قبول کرنے کی طرف مائل ہیں۔ پاکستانیوں اور افغانیوں میں سے بعض ہندوؤں سے شدید نفرت رکھتے ہیں۔ عموماً مقامی عسکریت پسند کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ''تاوقتیکہ انہیں کسی پر یہ شبہ نہ ہو جائے کہ وہ فوج کا جاسوس ہے۔ اگر کوئی شخص ان کے مطالبے پر کھانا یا پناہ دینے سے انکار کر دے تو اسے بھی مار دیا جاتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کلہند اور ایسے کئی اور دور افتادہ دیہات میں عسکریت پسند اکثر کھانے کے لئے ہندوؤں کے گھر جاتے ہیں اور ہندو خوف کے باعث جو کچھ یہ مانگیں فوراً دے دیتے ہیں، اور ان کی نقل و حرکت کے بارے میں آرمی مین کو کچھ نہیں بتاتے، اگر بتا دیں تو عسکریت پسندوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں۔''

سرپنچ کہتا ہے کہ تمام عسکریت پسندوں کا ہندو دشمن نہ ہونا عام تصور کے برعکس مکمل طور پر بعید از قیاس نہیں ہے۔ کلہند کے قتل عام کے بعد ممتاز کشمیری جو بھارت سے آزادی کی وکالت کرتے ہیں بشمول شبیر شاہ اور یاسین ملک کے، دوڑے دوڑے ڈوڈہ گئے اور کھلے عام حملوں کی مذمت کی حتیٰ کہ آتش بیان اسلام پسند سیّد علی گیلانی جو پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے پُرجوش حامی ہیں، اس قتل عام کی مذمت کے لئے ڈوڈہ جانا چاہتے تھے، انہیں پولیس نے وہاں نہ جانے دیا۔ جماعت اسلامی جموں و کشمیر کے ڈپٹی لیڈر غلام قادر وانی بمعہ امیر جماعت اسلامی ڈوڈہ یونٹ غلام نبی نائک کلہند پہنچے جہاں انہوں نے اس قتل عام کی مذمت کرتے ہوئے اس کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا (یہ وہ مطالبہ ہے جو مجھ سے ڈوڈہ میں ملنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں نے کیا تھا) اور اعلان کیا کہ اس واقعہ میں مارے جانے والے مردوں کے تین بچوں کی پرورش اور تعلیم کے اخراجات جماعت اسلامی برداشت کرے گی۔ جب ڈوڈہ ٹاؤن میں میری ملاقات غلام قادر وانی سے ہوئی تو اس نے مجھے جماعت کے اردو رسالے ''مومن'' کا تازہ ترین شمارہ پیش کیا جس میں اس خونی واقعے

کی واضح اور جلی الفاظ میں شدید مذمت کی گئی تھی۔

بی جے پی کے ترجمانوں کے اصرار کے بالکل برعکس ڈوڈہ میں ہندو مسلم تعلقات میں اتنا بُعد المشرقین نہیں کہ ضلع سے ہندوؤں کا اجتماعی خروج ناگزیر دکھائی دیتا ہو۔ اس علاقے میں آج بین المذاہب تعلقات اتنے بُرے نہیں جتنے گجرات میں ہیں۔ جہاں ریاست کی زیرِ سرپرستی مسلمانوں کی نسل کشی کے لئے چلائی گئی مہم کے تحت ہزاروں لوگ اپنی جانوں سے محروم ہو گئے تھے اور ان سے کہیں زیادہ افراد کو گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا اور اب بے شمار مسلمانوں کو خوف و ہراس کی فضا پیدا کر کے جھگیوں میں رہنے کے لئے دھکیل دیا گیا ہے۔ اگر ڈوڈہ میں بین المذاہب، بی جے پی کے بیان کردہ حالات سے آدھے بھی بُرے ہوتے (یا کوئی یہاں تک کہہ دے اور چاہتا ہو کہ کاش ایسا ہو جاتا تاکہ ہندو مفادات کی تکمیل ہوسکتی) تو وہ کمیونٹی باؤنڈریز کے آر پار پائی جانے والی مسلسل ہم آہنگی اور یکجہتی کی روایت کی کیسے توجیہہ کرے گا جس کا بمشکل ہی کبھی پریس نے ذکر کیا ہے۔

ہندو اور مسلمان اس روایت کو خطے میں تقریباً دو دہائیوں سے جاری عسکریت اور چپقلش کے باجود، آج تک مسلسل برقرار رکھے ہوئے ہیں؟ پھر اس حقیقت کی کیسے وضاحت کی جائے گی کہ نیشنل کانفرنس کے رہنما اور ڈوڈہ کی جامع مسجد کے خطیب خالد سہروردی نے کلہند میں کشت وخون کی اطلاع پاتے ہی مسجد کے لاؤڈ سپیکر کے ذریعے ان حملوں کی شدید مذمت کی اور ڈوڈہ بھر میں ''بندھ'' (جو ہندوؤں اور مسلمانوں نے پورے ضلعے میں منایا تھا) کا مطالبہ کیا اور وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے ایک بہت بڑے گروپ کی قیادت کرتے ہوئے کلہند پہنچے (جو کہ دو گھنٹے میں طے ہونے والا دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہے) وہ اپنے ہمراہ امدادی اشیاء بھی لائے اور قتل عام میں مارے جانے والوں کے پسماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی بھی کیا؟ کوئی اس واقعے کی کیسے توجیہہ کرے گا کہ میری ایک مولوی صاحب کے ساتھ کلہند میں ایک دلت بیوہ کے گھر میں ملاقات ہوئی جس کا بیٹا اس قتل عام کے دوران اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ جب تک یہ عورت اس بھیانک رات کی داستان سناتی رہی ان مولوی صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں لگی رہیں؟ یا اسی طرح ایک مسلمان نوجوان جس سے میری کلہند میں ملاقات ہوئی اس نے قتل

MashalBooks.org

عام کے اگلے روز اپنے گاؤں کے ہلاک شدہ ہندوؤں کی لاشیں چتا میں جلانے کی رسم میں بھرپور مدد کی اس کی کیسے وضاحت کی جائے گی؟ یقینی بات ہے کہ بی جے پی کی دلیل میں اتنے شگاف ہیں کہ انہیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بہت سے مسلمان جن سے میری ڈوڈہ میں ملاقات ہوئی کسی غیر جانبدارانہ تحقیقات کے بغیر اس الزام کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ کلہند کے قتل عام کے ذمہ دار مسلم عسکریت پسند تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ہر جگہ پائی جانے والی پاکستانی یا ہندوستانی ایجنسیوں کی کارستانی ہو۔ جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے ایجنڈے پر عمل کرنے کے لئے کوشاں ہے تاہم وہ بیک زبان اصرار کرتے ہیں کہ جو کوئی بھی اس کا ذمہ دار ہے، خواہ وہ ہندو ہے یا مسلمان وہ سخت ترین سزا کا مستحق ہے۔ ایک مدرسے کے طالب علم نے جس سے میں کلہند جاتے ہوئے ملا کہا، ''قرآن مجید کہتا ہے کہ ایک بے گناہ شخص کو قتل کرنے والا خواہ کوئی بھی مذہب رکھتا ہو ایسے ہے جیسے اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا ہے۔ اگر واقعی یہ فعل عسکریت پسندوں نے کیا ہے تو خدا انہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ قرآن کی اس آیت کا ہر کسی نے جس سے بھی میری ملاقات ہوئی، ذکر کیا اور کہا کہ خواہ یہ قتل عام عسکریت پسندوں نے کیا یا انڈین آرمڈ فورسز نے، خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکیں گے۔

سانحہ کلہند نے یقیناً کلہند کے ہندوؤں کے دلوں میں خوف پیدا کر دیا ہے لیکن وہ جانتے ہیں کہ ان کے گاؤں کے بیشتر مسلمان ان کے غم اور نقصان میں ان کے ساتھ ہیں۔ گاؤں کے ایک ہندو نوجوان نے مجھے یاد دلایا کہ ''ڈوڈہ میں پچھلے برسوں میں عسکریت پسند گروپوں کے ہاتھوں قتل ہونے والوں میں بیشتر مسلمان تھے اور جب ہمارے گاؤں میں قتل عام ہوا مقامی مسلمانوں نے مردوں کو جلانے کی رسومات میں ہماری مدد کی۔ ایک اور ہندو لڑکے نے کہا ''اس واقعے کے بعد انہوں نے ہمیں گاؤں چھوڑنے سے منع کیا، کیونکہ ہم اکٹھے رہتے رہے ہیں، خدا جانے ہم کتنی نسلوں سے ایک ساتھ رہتے چلے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ تقسیم ہند کے موقع پر عام فسادات میں بھی ہمارے گاؤں میں کچھ نہیں ہوا، ہم مسلمانوں پر اعتبار کرتے آ رہے ہیں کیونکہ وہ اچھے لوگ ہیں مگر ہماری طرح وہ بھی کھل کر اظہار کرنے سے گھبراتے ہیں، پھر وہ ہماری حفاظت کیسے کر سکتے ہیں؟''

MashalBooks.org

جس مکان میں بیٹھے ہوئے ہندو مجھے اپنے خوف و ہراس کی کہانیاں سنا رہے تھے ان کے مسلمان پڑوسی بھی وہاں اندر آ گئے اور انہوں نے کہا ''جو کچھ ہوا ہے اس پر ہم بے حد شرمسار ہیں، لیکن ہم کیسے مدد کر سکتے تھے؟ رات کو جب یہ ہو رہا تھا اگر ہم بھی باہر نکل آتے گن مین ہمارا بھی یہی حشر کرتے۔'' ایک معمر مسلمان نے کہا: ''اس واقعے نے یہاں ہمارے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی ہے، اس سے پہلے ایسی کوئی دیوار نہیں ہوتی تھی۔ ہم دلی طور پر اس واقعے کی مذمت کرتے ہیں مگر اب ہم اپنی بے گناہی کیسے ثابت کریں؟'' یہ کہتے ہوئے اس کے جھریوں بھرے رخساروں پر سے آنسو بہنے لگے۔

اس شخص کے ہندو پڑوسی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ''یہ لوگ میرے اپنے خاندان کے افراد کی طرح ہیں، انہیں اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو اپنے بچپن سے جانتے ہیں۔ جب قتل عام ہوا اس کے بعد میں موت یا اغوا کر لئے جانے کے خوف سے مویشیوں کو چرانے کے لئے کبھی پہاڑوں پر نہیں لے گیا، اس لئے میں انہیں ہمسائے کے مویشیوں کے ساتھ بھیج دیتا ہوں، ایک اور مسلمان میرے کھیت میں ہل چلا دیتا ہے۔''

میں کلہند سے واپس جانے کے لئے اس پتھریلے راستے پر چلنے لگا جسے طے کر کے یہاں پہنچا تھا، ایک معمر شخص میرے ساتھ ہو لیا جس کے بارے میں مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ ایک صوفی بزرگ کا مرید ہے، اس نے کہا کلہند میں جو کچھ ہوا بڑا خوفناک واقعہ تھا، ''یہ اسی قسم کا مکروہ واقعہ ہے۔ جیسا گجرات میں ہوا، پتہ نہیں ایسے اور کتنے ہی واقعات ہو جائیں گے۔'' اس پر میں سناٹے میں آ گیا میں سوچنے لگا کہ اس نے کیا کہا ہے، پھر وہ بولا، ایسا تشدّد، اُف! خدشہ ہے کہ ایسے واقعات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے جتنی جلدی ہم ان کا خاتمہ چاہتے ہیں۔''

میں نے اس کی وضاحت چاہی تو وہ کہنے لگا 'یہ سب کچھ تنازعۂ کشمیر کے معلّق رہنے کا نتیجہ ہے۔ جب تک بھارت اور پاکستان اور جموں و کشمیر کے عوام کسی قابل قبول حل پر متفق نہیں ہوتے ایسی چیزوں کو کون روک سکتا ہے؟ بے گناہوں کو خواہ عسکریت پسند قتل کریں یا مسلح افواج، یہ اللہ کی منشا کے خلاف ہے۔'' میں اس سے زیادہ کس چیز سے متفق ہو سکتا تھا

جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ متعصب ہندو، فاشسٹ اور انقلابی اسلام پسند جو بظاہر ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں درحقیقت یہ ایک دوسرے کو کھا کر پلتے ہیں۔ یہ دونوں ڈودہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے ہیں اور اس وطن کو ایک نہ ختم ہونے والے مخمصے میں دھکیل رہے ہیں۔

[جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶]

MashalBooks.org

جموں میں دلت: شنوائی کا مطالبہ

جموں کشمیر میں دلت مجموعی آبادی کا تقریباً دسواں حصہ یا صوبہ جموں کی آبادی کا ایک تہائی حصہ ہیں۔ لیکن کشمیر کے سوال پر ہونے والی بحث میں دلت آواز بالکل غائب پائی جاتی ہے۔ اس ریاست میں ہندوؤں سے خصوصی طور پر ایک ''متجانس مجموعے'' (homogenenous whole) کی حیثیت سے سلوک کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات وادی کے پنڈتوں اور جموں کے ڈوگروں میں فرق کیا جاتا ہے۔ تاہم جب جموں وکشمیر میں مختلف مذاہب کے باہمی تعلق کا جائزہ لیا جائے تو دلت تناظر کو درمیان میں لانا فیصلہ کن عنصر بن جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال دلتوں کی صرف عددی اہمیت کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ اس لئے بھی پیدا ہوئی ہے کہ وہ ریاست کی انتہائی نظر انداز کردہ کمیونٹیز میں سے ہے۔

جموں وکشمیر میں سرکاری طور پر تسلیم شدہ شیڈولڈ کاسٹس کی تعداد 13 ہے۔ ریاست کی ساری دلت آبادی تقریباً صوبہ جموں میں مرتکز ہے۔ دلت جو کہ ہندو شمار ہوتے ہیں ان کے علاوہ یہاں بے شمار دوسرے لوگ ہیں جو صدیوں سے سکھ مذہب، عیسائیت اور اسلام میں داخل ہو گئے۔ جموں کے ممتاز امبیدکر فعالیّت پسند ٹی آر آزاد کے مطابق تاریخی طور پر ریاست کے دلت ہندوستان کے دیگر علاقوں کے بے شمار دلتوں کی طرح ذات پات اور براہمنی مذاہب سے نجات کے لئے ایسے مذاہب میں شامل ہو گئے جو نظریاتی طور پر مساواتِ انسانی کا دعویٰ رکھتے تھے۔ بہت سے دلت جو آج ''ہندو'' شمار ہوتے ہیں فرقہ وارانہ روایات کے حامل ہیں۔ نظریاتی طور پر حامیٔ مساوات اور مخالفِ برہمنیت ''روی داسی'' اور ''کبیر پنتھی'' ہیں۔ یہ روایات برہمنیت کو بطور وسیلہ اختیار کرنے کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتی ہیں اور تمام انسانوں کی مساوات پر بھی زور دیتی ہیں۔ کبیر ''پنتھ'' کے سلسلہ میں

MashalBooks.org

مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین بھی مساواتِ باہم کی تلقین کی جاتی ہے۔ رسوم سے کلی طور پر انکار نہیں کیا جاتا لیکن بالآخر ان کی ضرورت کم کر دی جاتی ہے اور ان کی بجائے انفرادی اخلاقیات اور بے ہیئت خدا کی عبادت پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔

بہت بڑی تعداد رکھنے کے باوجود ریاست کے دلت اچھی طرح منظم نہیں ہیں۔ امبیدکر تحریک جو بھارت کے مختلف حصوں میں کافی مضبوط ہے، لیکن ریاست میں کوئی زیادہ وجود نہیں رکھتی۔ جموں میں صرف دو امبیدکر تنظیمیں ہیں، پہلی ''ڈاکٹر امبیدکر ایجوکیشن فاؤنڈیشن'' ہے اور دوسری کا نام ''دلت سہیتیہ اکیڈمی'' ہے۔ ایک مقامی دلت فعالیت پسند نے مجھے خبردار کیا ان خوبصورت ناموں کے دھوکے میں مت آیئے، یہ صرف کاغذی تنظیمیں ہیں جن کا کام صرف ''امبیدکر'' کا یوم پیدائش منانے، دلت گورنمنٹ ایمپلائز کے خلاف انتقامی کاروائیوں پر احتجاج کرنے اور کبھی کبھار انتخابات کے موقع پر مؤثر طور پر ووٹ استعمال کرنے تک محدود ہے۔

جموں میں دلت تحریک کے کمزور ہونے کا ایک سبب جس کا امبیدکروں نے اکثر مجھ سے ذکر کیا، یہ ہے کہ یہاں دلتوں کی وسیع اکثریت اب تک اپنے آپ کو ''ہندو'' کے طور پر شناخت کراتی ہے اور دلتوں کے اندر رہ کر ہی کام کرتی ہے جبکہ بھارت کے متعدد دیگر حصوں میں کام کے برعکس ''امبیدکر بودھسٹ گروپ'' یہاں صرف برائے نام موجود ہے۔ اگرچہ حالیہ برسوں میں بٹوال ذات کے کوئی 2000 دلت بودھ ازم میں داخل ہو چکے ہیں وہ صرف برائے نام بودھ ہیں ان کے بہت سے عقائد اور رسمیں بدستور ہندوؤں جیسی ہیں کیونکہ خطے میں دلت تحریک اب بھی کمزور ہے، سرکاری ملازمتوں میں 8 فیصد کوٹے سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا اور بہت سے دلتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بی جے پی کے ساتھ منسلک ہیں جو کہ عموماً دلت مخالفت سمجھی جاتی ہے۔

شیخ عبداللہ کے دور اقتدار میں جموں وکشمیر میں انقلابی زرعی اصلاحات پر عمل درآمد ہوا تھا جن کے نتیجے میں بے زمین دلت مزدوروں کو پلاٹ الاٹ ہوئے تھے جس سے ریاست کے دلتوں کے مالی حالات کافی بہتر ہو گئے تھے اور اگرچہ ان کی اکثریت اب بھی مزدوروں دستکاروں اور چھوٹے دکانداروں کی ہے۔ ایک چھوٹا متوسط طبقہ وجود میں آ چکا

ہے یہ تقریباً سارے کا سارا سرکاری ملازمین پر مشتمل ہے جو ریاست میں ناتجربہ کار امبیدکر تحریک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ بعض دلتوں کے اقتصادی حالات بہتر ہو جانے کے باوجود ان میں ذات پات کی تفریق بدستور پھیل رہی ہے خاص طور پر جموں، کٹھوعہ اور ادھم پور کے مضافات میں بہت زوروں پر ہے۔ مجھے ہندو راجپوت جاگیرداروں کی طرف سے دلتوں کو محض اس بنا پر دیہات سے نکال دیئے جانے کی کہانیاں سنائی گئیں کہ انہوں نے گلیوں میں شادی کے جلوس نکالنے کی جسارت کی تھی، انہیں کرائے پر مکان دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے اور بالائی طبقے کے لڑکے دلتوں کے لڑکوں پر پھبتیاں کستے ہیں۔ کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروسز کے ایک سینئر ترین دلت آفیسر آر ایل جنگلار نے بتایا کہ جب وہ جموں کے ایک کالج میں لیکچرر تھا، ایک برہمن جاگیردار نے اسے مکان کرائے پر دینے سے محض اس کی ذات کی وجہ سے انکار کر دیا۔ اس نے بتایا کہ ایسی چیز اب تک بدستور چلی آ رہی ہیں۔

ایک نوجوان دلت سکول ٹیچر نتھو رام نے، جس سے میری ملاقات ڈاکٹر امبیدکر ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے دفتر میں ہوئی تھی، بتایا کہ ''ہندو راشٹرا میں دلتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے سوائے ایک ڈھیر کی تہہ کے۔'' اس نے زوردار دلیل دیتے ہوئے کہا: ''ہندوازم یا ہندوتوا، یا آپ اسے کوئی بھی نام دیں، اس کے معنی آریائی بالادستی کی حفاظت کرنے اور اسے فروغ دینے کے ہیں۔ تاہم اس نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ریاست میں کئی دلت بی جے پی کے پُرجوش حامی ہیں۔ ''وہ سُپر ہندو کہلانا چاہتے ہیں تاکہ اپر کلاس ذاتیں انہیں قبول کر لیں مگر یہ ہرگز نہیں ہو سکے گا۔'' ساتھ ہی اس نے بی جے پی اور ہندو بالا دست گروپوں پر بے حد تلخی کا اظہار کیا، اس نے کشمیر میں اسلام کے نام پر عسکریت جاری رکھنے والوں کی بھی شدید مذمت کی۔ اگرچہ وادیٔ کشمیر میں کوئی غیر مسلم دلت نہیں، اس نے خدشہ ظاہر کیا کہ اگر ریاست پاکستان میں شامل ہوگئی تو دلتوں کی حالت مزید خراب ہو جائے گی۔ ''لشکر طیبہ جیسے گروپ تمام غیر مسلموں کو خواہ ان کی ذات اور طبقہ کوئی بھی ہو، دشمنِ خدا سمجھتے ہیں، ہم ان کے ماتحت رہنے پر کیسے متفق ہو سکتے ہیں۔'' تاہم اس نے اس بات سے اتفاق کیا کہ جموں میں دلتوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ اس نے بطور خاص ذکر کیا کہ بالائی طبقے کے ہندو دلتوں سے مسلسل اچھوت جیسا سلوک کرتے چلے آ

رہے ہیں جبکہ مسلمان ایسا نہیں کرتے۔

میں ڈاکٹر امبیدکر ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے دفتر میں پہنچا تو دلت فعالیت پسندوں کا اجلاس جاری تھا، وہ سیاست سے لے کر بودھسٹ کلچر تک اور عورتوں کے مسائل سے لے کر عسکریت پسندی سے متاثرہ علاقوں میں رہنے والے دلتوں کے حالات تک، ہر موضوع پر بحث کر رہے تھے۔ یہ تمام فعالیت پسند گورنمنٹ سروس میں تھے۔ اس سے اس بات کی یاد دہانی بھی ہو رہی تھی کہ دلت اب بھی بالائی طبقے کے زیر کنٹرول پرائیویٹ سیکٹر میں ہرگز ترقی نہیں پا سکتے۔ ان کی سوسائٹی میں مراعات یافتہ ارکان ہونے کے باوجود ان میں سے بہت سے افراد ذات پات کی تفریق کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ان میں سے بہت کم افراد کے بالائی ذات کے ہندو دوست ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کی اچھے مسلمانوں اور عیسائیوں سے واقفیتیں ہیں۔ اجلاس میں اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ ان کے لئے مذہب کی تبدیلی ان کے لئے باہر نکلنے کا واحد راستہ ہے، جس کے بعد ان پر یقین کیا جانے لگے گا۔

ہندوازم میں انہیں مساوات اور قبولیت کبھی نہیں مل سکے گی۔ ایک دلت نوجوان نے، جو ایک دیہی سکول میں پڑھاتا ہے، کہا: ''ہندوازم میں ایک عام اور سادہ انسان کا کوئی تصور نہیں، آپ کی ہمیشہ ایک ذات یا دوسری ذات کے فرد کے طور پر شناخت ہو گی۔ بالائی ذاتیں ہمیں ہندو صرف اس لئے کہتی ہیں کہ ان کی تعداد بڑھتی رہے۔'' کمرے میں موجود بیشتر افراد محسوس کرتے تھے کہ ان کی مسلسل پریشانیوں کا واحد حل یہ ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کر کے بودھ ازم میں داخل ہو جائیں۔ بعضوں نے کہا کہ وہ مستقبل قریب میں اگلے قدم کے لئے منصوبہ بنائیں گے تاہم انہوں نے اس سے بھی اتفاق کیا کہ بہت سے دلت جو امبیدکر تحریک سے متاثر نہیں ہوئے ان کی پیروی نہیں کریں گے۔ اجلاس میں ایک فعالیت پسند نے کہا: ''ان کا خیال ہے کہ وہ ہندو فرقے میں شامل ہو کر اور راجپوت یا برہمن ہونے کا دعویٰ کر کے اپنی ''کم'' ذات کو پیچھے پھینک دیں گے۔ زیادہ عرصے تک اس سے کام نہیں چل سکے گا۔

جس طرح دلتوں کو سماجی آزادی کے لئے مذہب تبدیل کرنے پر رضامند کرنا ایک مشکل کام تھا اسی طرح دلت تحریک کو وسعت دے کر تمام دلت ذاتوں کو اس میں شامل

کرنے پر متعلقہ افراد کو راضی کرنا بھی ایک دشوار امر تھا۔ جموں کے دلت بھی دیگر مقامات کے دلتوں کی طرح ایک متجانس کیٹیگری نہیں ہیں، وہ ایک درجن سے زائد ذاتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض ذاتیں برہمنی نظام کی منطق کو اختیار کر کے خود کو اپنے نظامِ مراتب کے تحت دوسری ذاتوں سے برتر سمجھتی ہیں۔ اس وجہ سے مختلف ذاتوں کا اکٹھے مل کر کام کرنا بے حد مشکل بن چکا ہے۔ جموں کی دلت تنظیموں پر ''چماروں'' کی اجارہ دار ہونے کا خاص طور پر الزام لگتا ہے، یہ ریاست کے اندر بہت ہی کثیر التعداد ذات ہے۔ تاہم لوگوں کا اصرار ہے کہ دلتوں کی مختلف ذاتوں کو مل کر کام کرنا چاہئے کیونکہ اگر ان میں اتحاد نہ ہوا تو ان کی کہیں بھی شنوائی نہ ہو گی۔ اجلاس میں ایک مقرر نے زور دے کر کہا ''اب جبکہ جموں و کشمیر کے مستقبل پر بحثیں زوروشور سے جاری ہیں اگر دلتوں کا نقطہ نظر نہ سنا گیا تو سب سے زیادہ نقصان میں ہم ہی ہوں گے۔'' مقررین نے کہا کہ یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ان کے مفادات جو کہ انہیں ''اونچی'' ذات کے ہندوؤں کے مفادات سے بالکل الگ متشخص ہوتے ہیں، جموں و کشمیر کے سیاسی مستقبل کے تعین کے موقع پر زیرِغور لائے جانے چاہئیں۔ اس کے لئے انہوں نے دلتوں کی علیحدہ سیاسی آواز اٹھائے جانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ریاست کی تمام مسلّمہ پارٹیوں پر یا تو کشمیری مسلمانوں کا غلبہ ہے یا اونچی ذات والے ہندوؤں کا غلبہ ہے، اس لئے ان سے دلتوں کے معاملات کی بہتری کے لئے کام کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس پر ایک جوشیلے نوجوان نے دوٹوک الفاظ میں کہا: ''ہم نے مسلمانوں کو آزمایا ہے اور ہم نے ہندوؤں کو بھی آزما کر دیکھ لیا ہے مگر انہوں نے ہمارے لئے کچھ بھی نہیں کیا، اس لئے ہمیں اپنی آواز کو قابلِ شنوائی بنانے کے لئے لازماً خود ہی بولنا ہو گا۔''

[10/نومبر2004ء]

MashalBooks.org

MashalBooks.org